سرحدی گاندھی
خان عبدالغفار خاں

راجہ اوستھی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سرحدی گاندھی
خان عبدالغفار خاں

راجندر اوستھی

مترجم

منظور عثمانی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی ۔ 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2003
دوسری طباعت	:	2011
تعداد	:	2100
قیمت	:	-/21 روپئے
سلسلۂ مطبوعات	:	1071

Khan Abdul Ghaffar Khan

By

Rajinder Avasthi

ISBN :978-81-7587-694-1

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر: 26109746، فیکس: 26108159
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho(Top) کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کر سکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

پیش لفظ

اسکولی تعلیم کے سب ہی درجات کے لیے مناسب تعلیمی پالیسی نصاب اور نصابی کتب کی تیاری میں نیشنل کونسل پچھلے پچیس سالوں سے سرگرم عمل ہے۔ ہماری کوششوں کا محسوس اور غیر محسوس طریقے پر جو اثر پڑا ہے اس پر کونسل کے تمام ارکان بجا طور پر اطمینان کا احساس کر سکتے ہیں۔

لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ اچھے نصاب اور تدریسی کتب کے باوجود ہمارے طلبا میں آزادانہ مطالعہ کا شوق زیادہ پروان نہیں چڑھ پاتا۔ اس کا خاص سبب یقیناً ہماری ناقص ایگزامینیشن پالیسی ہے جس میں نصابی کتب میں دی گئی معلومات کا ہی امتحان لیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت ہی کم اسکولوں میں غیر درسی کتابوں کو پڑھنے کے لیے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ لیکن طلبا کے غیر درسی کتب کے نہ پڑھنے کا ایک خاص سبب یہ بھی ہے کہ مختلف ایج گروپ کے بچوں کے لیے معیاری غیر درسی کتابیں دستیاب نہیں۔ اگرچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے پچھلے چند سالوں میں کچھ پیشرفت ضرور ہوئی ہے لیکن وہ بہت ہی ناکافی ہے۔

اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے کونسل نے بچوں کے لیے کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں ایک بہت ہی اہم اسکیم کی شروعات کی ہے۔ اس ضمن میں "پڑھیں اور سیکھیں" عنوان کے تحت کتابوں کی ایک سیریز شائع کرنے کے پلان کی ابتدا کی گئی ہے۔ اس کے تحت مختلف ایج گروپ کے بچوں کے لیے آسان زبان اور دلچسپ انداز میں مختلف موضوعات پر بڑی تعداد میں کتابیں تیار کی جائیں گی۔ ہمیں امید ہے کہ درج ذیل موضوعات پر 1988 کے آخر تک اردو میں پچاس کتابیں تیار کر سکیں گے۔

الف	کم عمر کے بچوں کے لیے کتابیں

ب	کتھا لٹریچر

ج سوانح عمریاں

د دیس بدیس کا تعارف

ہ تہذیبی عنوانات

و سائنسی موضوعات

ز علم معاشرت

کتابوں کی تشکیل میں ہم مصنفین، تجربہ کار اساتذہ، لائق آرٹسٹوں کا تعاون حاصل کر رہے ہیں۔ ہر ایک کتاب کی تیاری میں زبان، طرز تحریر اور موضوع پر تحقیقی نظر اور اجتماعی غور وخوض کرنے کے بعد آخری شکل دی جائے گی۔

کونسل اس سیریز کی کتابوں کو لاگت کی قیمت پر ہی شائع کر رہی ہے تاکہ ملک کے گوشے گوشے تک پہونچ سکیں۔ مستقبل میں ان کتابوں کا دوسری زبان میں ترجمہ کرانے کا منصوبہ بھی زیر غور ہے۔

ہمیں امید ہے ایجوکیشنل پالیسی، نصاب اور نصابی کتابوں کی طرح ہی کونسل کی اس اسکیم کی بھی وسیع پیمانے پر پذیرائی کی جائے گی۔

موجودہ کتاب کو تیار کرنے میں محترم راجیندر راو ستھی نے ہماری درخواست قبول فرمائی ہم اس کے لیے ان کے بے حد ممنون ہیں۔ اس کے علاوہ جن جن ماہرین تعلیم، اساتذہ اور فنکاروں کا تعاون ہمیں حاصل رہا ہے ان کے تئیں بھی میں تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

کونسل کی یہ اسکیم پروفیسر انیل ودیالنکر کی رہنمائی میں چل رہی ہے۔ ان کے معاونین میں شریمتی سینو کتالودرا، ڈاکٹر رام جنم شرما، ڈاکٹر سریش پانڈے، ڈاکٹر ہیرالال باچھوتیا اور ڈاکٹر انوردھ رائے کا تعاون بھی ہمیں حاصل ہے۔ سائنسی کتب کی تیاری کے فرائض شعبہ سائنس اور ریاضی سے متعلق ڈاکٹر رام دلار شکل کے ذمے ہیں۔ اسکیم کی عمل آوری میں ڈاکٹر باچھوتیا خاص

طور سے سرگرم رہے ہیں۔ میں اپنے سب شرکاء کار کا مبارکباد کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سیریز کی کتابوں پر بچوں، استادوں اور والدین کی آراء کا ہم استقبال کریں گے تاکہ ان کی روشنی میں ان کتب کو مزید مفید بنانے میں ان کا تعاون حاصل ہو سکے۔

پی۔ ایل۔ ملہوترہ

ڈائریکٹر

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

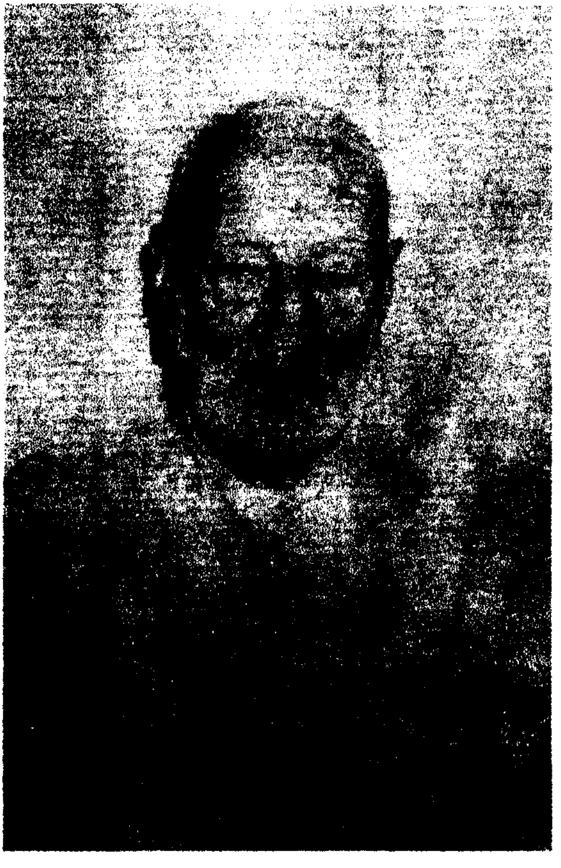

خان عبد الغفار خان

مجسّس آنکھیں، لمبی ناک، سفید داڑھی میں چھپی دودھیاہنسی۔جب قہقہہ لگاتے تو سارا ماحول مسرت سے جھوم اٹھتا۔یہ تھی خان عبد الغفار خاں کی ہنسی۔ بادشاہ، سچ مچ کے شاہوں کے شاہ۔ قد چھ فٹ تین انچ چہرے پر غیر معمولی جلال اور نور۔ بیمار ہو کر بھی بیمار نہ لگتے تھے۔ دل کو موہ لینے والی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی۔ یوں لگتا گویا ان کے چہرے پر پوری تاریخ رقم ہو۔ آزادی کی لڑائی لے کر پوری زندگی کی کشمکش سچ تو یہ ہے کہ بادشاہ خان فرد نہیں بلکہ مجسم تاریخ تھے۔ایسی تاریخ جس کا ہر ورق جہد مسلسل کی داستاں تھا۔

بادشاہ خان ہست نگر میں جواب اشت نگر کے نام سے جانا جاتا ہے پیدا ہوئے۔وہیں اتمان زئی نام کے گاؤں میں ان کا بچپن بیتا۔ والد کا نام بہرام خان تھا۔ اپنی پیدائش کے بارے میں خان صاحب بڑے مزیدار بیان فرمایا کرتے تھے کہتے تھے

"ہمارے زمانے میں یہ دستور تو تھا نہیں کہ بچے کی تاریخ پیدائش لکھ لی جاتی ہو۔ لوگ پڑھے لکھے تو تھے نہیں نہ ہی ان سے کہا جاتا تھا کہ پیدائش کا اندراج کرائیں اسی لیے اصلی تاریخ یاد نہیں رہ پاتی تھی۔ شام، دوپہر صبح سے جنم کا حساب رکھا جاتا تھا۔ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کی جب شادی ہوئی تب میں گیارہ سال کا تھا۔ان کا بیاہ 1901 میں ہوا تھا تو میں 1890 میں پیدا ہوا ہوں گا۔ چنانچہ یہی میری تاریخ پیدائش تسلیم کرلی گئی"۔

ان کے والد ایک بہت بڑے خان تھے لیکن اتنے اونچے خاندان سے تعلق ہونے کے باوجود ان میں غرور کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ وہ وسیع القلبی، رحم اور انکساری کا مجسمہ تھے۔ یہی اوصاف خان عبد الغفار خان میں پائے جانے فطری تھے۔ ان کی والدہ بھی ایسی فیاض تھیں۔ وہ محلے کے

غریب غرباء کے لیے سالن کی ایک دیگچی پکایا کرتیں اور تھوڑا سالن سب میں تقسیم کر دیا کرتیں ان کے پڑوس کی مسجد میں جو بھی مسافر ٹھہرتا اس کی ضیافت انہی کے گھر سے ہوتی تھی۔ ان کے والد کو اجنبیوں کی خاطر داری میں بڑا لطف آتا تھا کہتے تھے۔ "یہ تو خدا کے بھیجے ہوئے اس کے بندے ہیں"۔ خان عبدالغفار میں اپنے والدین کی ساری خوبیاں سمٹ آئی تھیں۔ انھیں اپنے ماں باپ سے ہی یکی اور بے لوث خدمت کا جذبہ ورثہ میں ملا تھا۔ کشادہ دلی، فیاضی اور خودداری والدین سے انھیں ودیعت ہوئی تھیں۔ ان کی جائے پیدائش پختونستان میں واقع ہے۔ پختون انھیں پیار سے "باچ خان" کہتے تھے۔ بھارتیوں نے انھیں "سرحدی گاندھی" کے لقب سے نوازا۔ دنیا والے انھیں بادشاہ خان کے نام سے جانتے ہیں۔

جب خان صاحب پانچ یا چھ سال کے ہوئے تو ان کے والد صاحب نے انھیں تعلیم کے لیے اپنی مسجد کے مولوی کے سپرد کر دیا۔ مولوی صاحب بیچارے خود ہی پڑھنے لکھنے میں نااہل تھے۔ وہ قرآن شریف تو ضرور پڑھ سکتے تھے اور انہیں کچھ سورتیں بھی یاد تھیں لیکن ان کے معنی یا ترجمے سے وہ نابلد تھے۔ پھر بھی پڑھانا تو مولوی صاحب ہی کو تھا۔ جس دن خان صاحب نے سپارہ پڑھنا شروع کیا والدین کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مٹھائی تقسیم ہوئی۔ خوب خوشیاں منائی گئیں۔ اس طرح ان کی تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ لیکن یہ تعلیم برائے نام ہی تھی۔ حروف تہجی کی پہچان نہ ہوئی۔ اسی لیے شروع شروع میں انھیں استادوں کی ڈانٹ اور مار بھی کھانی پڑی۔ وہاں کے بڑے بڑے گاؤں میں بھی ایک دو ہی پرائمری اسکول ہوا کرتے تھے۔ کہیں کہیں تو ایک دو ہی معلم ہوتے۔ ان دنوں انگریزوں کا راج تھا۔ انگریزوں نے تب ہی ہر ایک فرقہ کو اپنی اپنی مادری زبان میں تعلیم دیے جانے کی پالیسی رائج کی تھی۔ یہ آسانی اکثر سب ہی کو حاصل تھی لیکن پٹھانوں کے لیے ایسا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ ان کے لیے بہت کم اسکول تھے۔ ان اسکولوں کے پیچھے بھی نیم ملا

پڑے رہتے تھے جو آئے دن فتوے دیتے رہتے کہ جو بچے ان اسکولوں میں پڑھتے ہیں وہ پیسوں کے لیے ایسا کرتے ہیں ایسے لوگوں کو جنت میں جگہ نہیں ملے گی اور وہ دوزخ میں دھکے کھاتے پھریں گے ۔اس طرح کا پروپیگنڈہ جان بوجھ کر کیا جاتا تھا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ پٹھان بدستور جاہل اور بے وقوف بنے رہیں۔ ان کے لیے تعلیم کا جو تھوڑا بندوبست تھا وہ مسجدوں میں ہی تھا۔ وہاں بھی تعلیم صرف مذہبی رہنمائی کے لیے ہی دی جاتی تھی۔ کچھ دنوں کے لیے خان صاحب کی تعلیم کا بندوبست بمبئی کے ایک مشن ہائی اسکول میں ہو گیا اور وہ وہاں اپنے ملازم بارانی کاکا کے ساتھ چلے گئے۔ کاکا انھیں فوجیوں کے قصے کہانیاں سنایا کرتے تے۔ اسی سے ان کے دل میں فوج میں نوکری کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ انھوں نے اپنے والدین سے اس بارے میں ہدایت چاہی۔ اس کے بعد فوج کے بھرتی دفتر میں ان کا معائنہ ہوا جس میں پوری طرح سے فٹ پائے گئے اور ان کا انتخاب کر لیا گیا۔ انھوں نے براہ راست کمیشن کے ذریعہ اپنے انتخاب کا ذکر ہم سے بڑے دلچسپ انداز میں یوں کیا:۔

”میں میٹرک پاس چھ فٹ تین انچ اونچا خوبصورت نوجوان تھا اسی وجہ سے پلٹن کے انگریز مجھے دل سے پسند کرتے تھے ان کی خواہش تھی کہ میں اس پلٹن میں شامل ہو جاؤں۔ والد صاحب بھی ایسا ہی چاہتے تھے۔ وہ اس تصور سے کافی خوش تھے کہ ان کا بیٹا اس لائق سمجھا گیا اور میں نااہل قرار دیے جانے سے بچ گیا“۔

اس کے بعد خان صاحب نے پھر تعلیم کی طرف توجہ دی۔ ان کے ڈاکٹر بھائی نے انھیں انگلینڈ جاکر انھیں انجینیرنگ کی ڈگری حاصل کرنے کی صلاح دی جو مان بھی لی گئی۔ ان کی جہاز میں سیٹ بھی بک ہو گئی لیکن جب رخصت کی گھڑی آئی تو ان کی ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ولایت جانے والا لوٹ کر نہیں آتا۔ ان کے دو ہی بیٹے تھے۔ ایک پہلے

ہی سے انگلینڈ میں تھا دوسرا بھی چلا جائے گا۔یہی ڈر ان کو اندر اندر کھائے جا رہا تھا۔ان کے آنسو رکنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ یہ دیکھ کر ان کے والد کا دل پسیج گیا۔ چنانچہ آخری لمحوں میں خان صاحب کو ولایت بھیجنے کا خیال ترک کر دیا گیا۔فیصلہ یہ ہوا کہ ایک بیٹا گھر پر ہی رہنا چاہیے۔

اس کے بعد خان صاحب اداس رہنے لگے۔ نوجوان خون رگوں میں جوش مار رہا تھا۔ان کا دھیان سیاست کی طرف گیا۔انگریز روز نت نئے قانون لا رہے تھے جس سے عوام کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔اسی دوران چند سیاسی کارکن ان کے پاس آئے اور انھیں سیاست میں حصہ لینے اور انگریزوں کے خلاف لڑنے کی دعوت دی۔ یہی وہ وقت تھا جب خان صاحب نے میدان سیاست میں پہلا قدم رکھا۔

1901 میں ایک نیا قانون "فرنیٹر کرائمز ریگولیشن ایکٹ" (Fronter Crimes Regulationg Act.) کی روسے پنجاب سے صوبہ سرحد کو الگ کر دیا گیا۔ یہ قانون بڑا بھیانک تھا اسے "کالا قانون" کا نام دیا گیا۔

تعجب کی بات یہ کہ فرنگیوں نے اس کا استعمال بھی برے طریقے سے کیا اس سے پٹھانوں کے بیچ آپسی پارٹی بندی، پھوٹ اور دشمنی کو بڑھاوا ملا۔ اس سے اس کی خودداری کو بھی ٹھیس پہنچی۔ فرنگی عورتوں کو بھی کھینچ کر کورٹ کچہری لے جانے لگے۔ جو شخص بھی ان کی نظر میں ناپسندیدہ ہوتا اس کے خلاف جھوٹا مقدمہ گھڑ لیا جاتا۔ ایسے مقدموں میں کسی ثبوت کی بھی ضرورت نہ ہوتی اور نہ ہی اپیل کی اجازت تھی۔اس کی روسے چودہ سال تک کی سزا ہو سکتی تھی۔

دراصل پٹھانوں کو کچل دینے کے لیے انگریز نئے نئے قوانین بناتے رہتے۔وہ پٹھانوں کی طاقت سے آگاہ تھے۔ پٹھان بھی جہاں کہیں کسی انگریز کو دیکھ لیتے بغیر ایذا پہنچائے نہ چھوڑتے۔ بہت سے فرنگی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ خان صاحب نے خدمت خلق کا بیڑہ اٹھالیا۔لوگوں کے

ذہنوں سے بے علمی اور جہالت کی تاریکی دور کرنے کی ان پر دھن سوار ہوگئی۔ انھوں نے اپنے گرد کچھ لوگوں کو اکٹھا کیا۔ ان کی ملاقات مولانا عبید اللہ سندھی سے بھی ہوئی۔ وہ ایک عظیم انقلابی تھے۔ آپ نے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو قرآن شریف کی تعلیم دی۔ ہر ایک بی۔ اے پاس طالب علم کو =/50 روپے ماہانہ وظیفہ بھی دیا گیا۔ اس طرح تعلیم کی ترقی اور تشہیر ہونے لگی۔

1912ء میں خان عبدالغفار خاں کی شادی ہوئی۔ اگلے ہی سال ایک بیٹے کے باپ بن گئے۔ بیٹے کا نام "خان غنی" رکھا گیا۔ اسی دوران لوگوں کی بڑھتی ہوئی سازشیں انھیں ظلم کے خلاف آواز اٹھانے پر مجبور کرنے لگیں۔ وہ پریشان تھے۔ گھر میں بیٹے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ عورتیں ڈھول بجا رہی اور گا رہی تھیں۔ جب کہ عوام ظلم کی چکی میں پسے جا رہے تھے۔ خان صاحب نے گانا بجانا بند کرا دیا انھوں نے عوام کی خدمت کو ہی اپنا فرض اولین سمجھا۔

1913 میں ان کی نظر سے مسلم لیگ کے اعلانات گذرے۔ سالانہ کانفرنس کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ وہ مسلم لیگ کے صدر کی تقریر سننے کے لیے بےچین ہو اٹھے اور انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ آگرہ جانے کی ٹھان لی۔ پوری کانفرنس کو انھوں نے بغور دیکھا۔ کانفرنس کے اختتام پر وہ دہلی گئے لیکن یہاں وہ بیمار پڑ گئے اور انھیں گھر واپس لوٹنا پڑا۔ پر گاؤں میں بھی سکون نہ ملا مسلم لیگ کے جلسے میں سنی ہوئی تقریریں ان کے دماغ پر چھائی رہیں۔ انگریزوں کے ہاتھوں ڈھائے گئے مظالم کی داستانیں سن سن کر ان کا دل دہل اٹھتا اور ان کا من کسی طور پر قابو میں نہ آتا۔

1914ء میں ایک عظیم واقعہ ہوا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے انھیں دیوبند طلب کیا۔ خان صاحب نے وہاں جانا قبول کر لیا۔ ٹھیک وقت پر وہ دیوبند پہنچے۔ وہاں یہ مشورہ کیا جا رہا تھا کہ ہندوستان کو آزادی دلانے کے لیے سرحد کے آزاد علاقے میں ایک مرکز قائم کیا جائے۔ یہ طے

کیا گیا کہ انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جدوجہد کرنی ہوگی تب ہی ملک ان کے چنگل سے آزاد ہوپائے گا۔ یوں ملک کو آزاد کرانے کے لیے کچھ دوسری تنظیموں کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا۔ لیکن یہ سب موج اڑاتیں ان کا کوئی کام نہیں تھا۔ ان تنظیموں کے ممبران خفیہ پولیس کے اعلیٰ عہدیدار مسٹر شارٹ سے ساز باز رکھتے تھے۔ جب ان لوگوں کی سازشوں کا بھانڈا پھوٹا تو شیخ الہند نے درپردہ ایک نیا مرکز بنانے کا منصوبہ تیار کیا۔ عبدالغفار خان اور ان کے ساتھی فضل محمود کے باجوڑ کے کسی محفوظ علاقہ کی تلاش میں جانے کا دلچسپ بیان خان صاحب نے ان الفاظ میں کیا:۔

''ہم خفیہ طریقہ سے باجوڑ چلے گئے۔ تخت بائی سے ہم لوگ ریل گاڑی میں سوار ہوئے۔ درگائی اسٹیشن پر اتر کر ٹم ٹم کیا۔ جب مالاکانڈ کے دروازہ پر پہنچے تو ہمیں بڑی فکر ہوئی۔ پولیس کے سپاہی ہر ایک کی تلاشی لے رہے تھے۔ پوچھ تاچھ کے درمیان کسی پر اگر ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا تو اسے گرفتار کر لیتے۔ شکل وصورت اور اپنے ڈیل ڈول کی بنا پر میں چھپ نہیں سکتا تھا۔ میں سب سے زیادہ متفکر اسی بات سے تھا۔ پولیس چوکی سے بچ نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ میں ٹم ٹم کی پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ مجھے ایکدم سے ایک ترکیب سوجھی میں نے اپنا جسم پوری طرح چادر سے ڈھک لیا۔ اسی بیچ پولیس کے سپاہی ہماری تلاشی لینے کے لیے آدھمکے۔ میرے باقی ساتھی تو اتر گئے۔ میں گٹھری کی طرح سمٹ گیا میں نے ہاتھ پاؤں سر منہ سب ڈھک لیے تھے۔ سپاہی نے ٹم ٹم پر نظر دوڑائی اور اس نے بہ آواز بلند کہا ''تم لوگ جاسکتے ہو'' میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ گھنٹے بھر سے میں دم سادھے بیٹھا رہا تھا۔ ہاتھ پیر سمیٹے رہنے سے سارے جسم میں شدید درد تھا لیکن مجھے اس تکلیف کی کوئی چنتا نہیں تھی بلکہ میں تو اسے بھول ہی گیا۔ مجھے خوشی تھی تو یہ کہ میں نے کتنی ہوشیاری سے سپاہیوں کو بیوقوف بنادیا تھا۔ مجھے لگا کہ سب سپاہی بیوقوف ہوتے ہیں۔ بس خانہ پری کرنا جانتے ہیں۔ اس دن کا قصہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ آگے بڑھے تو پھر سپاہیوں سے سابقہ

پڑا لیکن اس بار انھوں نے کوئی پوچھ تاچھ نہیں کی۔ بس بت کی طرح کھڑے رہے۔ راہ میں بے حد مشکلات کا سامنے کرتے ہوئے ہم سمرقند جا پہنچے۔ یہاں ہمارا قیام شیخ صاحب کے یہاں رہا۔ سمرقند سے ہم مالاکانڈ پہنچے۔ وہاں انگریزوں کی اتنی دہشت پھیلی ہوئی تھی کہ بڑے سے بڑے آدمی کی نظر بھی ان پر پڑ جاتی تو وہ خوف سے پیلا پڑ جاتا تھا اور ہاتھ پیر کانپنے لگتے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اگر کوئی انگریز کے سامنے پڑ جاتا اور وہ اُسے سلام نہ کرتا تو گرفتار کر لیا جاتا۔ اس کے بعد اسے کاٹھ میں ڈال دیا جاتا۔ کاٹھ ایک بھاری لمبی سی لکڑی ہوتی اس میں سوراخ ہوتے تھے۔ ان سوراخوں میں آدمی کے پیر دبا دیے جاتے اوپر سے لکڑی کے ڈھکن کو ٹھوک کر بند کر دیا جاتا۔ اس طرح وہ غریب کاٹھ میں پھنسا رہتا۔ انگریزوں کے بارے میں رت نئی کہانیاں سن کر خان صاحب کے دل میں باغیانہ جذبات سر ابھار رہے تھے۔

ادھر انگریزوں نے پختونوں کے مدارس بھی بند کروادیے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی بھی پٹھان بچہ تعلیم یافتہ ہو۔ انھوں نے اسکول تو بند کرا ہی دیے تھے استادوں کو بھی ڈیرہ اسماعیل خاں کی جیل میں ڈال دیا۔ چاروں طرف انگریزوں کی دہشت چھائی ہوئی تھی۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ کوئی بات بھی منہ سے نکال سکے۔ کوئی ایک لفظ بھی بولتا تو جیل میں ٹھونس دیا جاتا عبدالغفار خان ان سے لوہا لینا چاہتے تھے۔

دسمبر/ 1915ء میں خان صاحب کے یہاں دوسرا بیٹا پیدا ہوا اس وقت ان کا پہلا بیٹا غنی خان تین سال کا تھا۔ ادھر پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ اس کی لپیٹ میں بہت سے لوگ آگئے تھے۔ انفلوئنزا کی وباء میں سارا دیس مبتلا تھا۔ ایسے میں عبدالغفار صاحب پر بھی مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ان کا تین سال کا غنی انفلوئنزا میں بیہوش پڑا ہوا تھا۔ بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ موت کا سایہ سر پر لہرا رہا تھا۔ خان صاحب اس کی صحت کے لیے خدا سے دعا مانگ رہے تھے۔ ادھر غنی کی حالات بگڑتی

جارہی تھی لگتا تھا کچھ پل کا ہی مہمان تھا۔ تب ہی غنی کی والدہ نے چارپائی کے چکر لگائے اور سرہانے کھڑی ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھالیے۔ ممتا بھری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ التجا بھرے لہجے میں خدا کو مخاطب کرتے ہوئے یوں گویا ہوئیں "اے میرے پروردگار اس معصوم کی بیماری، اس کا سارا دکھ مجھے سونپ دے بس اسے تندرستی عطا کردے"

کہتے ہیں تبھی ایک کرشمہ ہوا۔ اگلے ہی دن سے بچے کی حالت سدھرنے اور ماں کی حالت بگڑنے لگی۔ آخر کار غنی تندرست ہو گیا اور اس کے بدلے اس کی ماں نے جان گنوادی۔ اس سانحے سے خان عبدالغفار خاں کے دل میں ایک نئی طاقت نے جنم لیا۔ ان کا خدا پر عقیدہ اور راسخ ہو گیا۔ بیوی کی جدائی ان کے لیے سوہان روح تھی۔ دکھ اور بیماری سے چھٹکارا دلانے کی بات ان کے دل میں گھر کر گئی۔ وہ سوچنے لگے سنگھرش (جہاد) کا بیڑہ اٹھایا جائے تو خدا ان کی ضرور مدد کرے گا۔ وہ ہمت، جوش، ولولے اور حوصلے کے ساتھ قدم بڑھانے لگے۔

1919ء میں رولٹ ایکٹ بنا۔ ہندوستان کے لوگ یہ امید باندھے ہوئے تھے کہ ان کی خدمات اور قربانیاں رنگ لائیں گی اور کچھ اختیارات ضرور حاصل ہوں گے لیکن قانون سامنے آیا تو ان کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ان کے سروں پر کالا قانون بدستور تلوار کی طرح لٹکا رہا۔ اس قانون کے خلاف سب کے دلوں میں سخت غم و غصہ تھا۔ روز جلسے ہونے لگے۔ مظاہرے ہوئے۔ خان عبدالغفار خان نے بھی ان مظاہروں میں حصہ لیا۔ انہوں نے جلسے کا انتظام کیا۔ وہ لوگوں میں اس قانون کے خلاف اتنا زیادہ جوش و خروش دیکھ کر حیران تھے کہ ایک آواز پر لاکھوں لوگ جمع ہو جاتے۔ سچ کہیں تو انہیں احتجاجات سے پٹھانوں میں ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا۔

ایک دفعہ واقعہ ہے کہ انگریزوں اور افغانوں میں تنازعہ چل رہا تھا مارشل لا سے محفوظ رہنے کے لیے خاں صاحب نے افغانستان جانے کی سوچی۔ تب ہی ان کے والد وہاں

پہنچے۔ انھوں نے دیکھا کہ صورت حال ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی گرفتار کئے جا سکتے ہیں۔ اس لیے ان کے باپ نے انھیں آگے بڑھنے سے روکا پولیس کا چاروں طرف پہرہ تھا۔ گھر گھر تلاشیاں لی جارہی تھیں۔ ایسی حالت میں وہ شام تک چھپے رہتے۔ جوں ہی رات کی تاریکی بڑھنے لگتی وہ گھر کی طرف بڑھتے رات میں کچھ چین کا سانس آتا۔ آخر اس آنکھ مچولی کی کوئی انتہا بھی تھی پولیس اتنی چوکنا تھی کہ سونگھ لیتی کہ کون کب، کہاں اور کیا کر رہا ہے۔ اس نے پتہ چلا لیا کہ خان عبدالغفار کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ اس نے اس جگہ کا گھیرا ڈال لیا۔ آخر کار انھیں گرفتار کر لیا گیا اور مردان جیل میں بند کر دیا۔ جیل کی بھی عجیب کیفیت تھی۔ وہ طویل القد اور تندرست انسان تھے۔ وہ لمبے ڈیل ڈول کے مالک تھے۔ پوری جیل میں ان کے ناپ کی بیڑیاں ہی نہیں ملیں۔ ان دنوں کا تجربہ سناتے ہوئے انھوں نے بتایا۔

"مجھے جیل لے جایا گیا۔ ان دنوں میں میری صحت بہت اچھی تھی۔ میں خوب ہٹا کٹا تھا۔ جب میرے پاؤں کی بیڑیاں نہیں ملیں تو جیل کے افسران نے انگریز کے ڈر سے ایسی بیڑیاں پہنادیں جو بڑی مشکل سے پاؤں میں آتی تھیں اس کے بعد مجھے کار میں بٹھا کر پیشاور لے گئے۔ وہاں مجھے بڑے کپتان کے روبرو پیش کیا گیا۔ پولیس مجھے حوالات کی طرف لیجارہی تھی۔ میرے پیروں میں تکلیف ہو رہی تھی۔ بیڑیاں جو زبردستی پہنائی گئی تھیں میرے پاؤں کو ریتی کی طرح کاٹ رہی تھیں۔ میرے دونوں پیر خون میں لت پت ہو گئے تھے۔ کھال پوری طرح ادھڑ چکی تھی۔ دوسرے دن میرے پاس ایک پولیس انسپکٹر آیا اور اس نے اونچی آواز میں حکم دیا "باہر آؤ، پیشی کی تاریخ ہے" میں نے کہا "میرے پاؤں زخمی ہیں میں پیدل نہیں چل سکتا" اس پر اس نے چلا کر کہا "جلوس نکال سکتے ہو، جلسہ گاہ تک جا سکتے ہو، صرف عدالت تک نہیں جا سکتے"۔

"مجھے اس قسم کے طعنوں سے روز سابقہ پڑتا تھا۔ اس وقت میری حالت واقعی ایسی ہی

تھی۔ایک قدم بھی چلنا دشوار تھا آخر وہ تانگہ لے کر آئے اور مجھے اس میں بٹھا کر کچہری لے جایا گیا۔ مجھے گھنٹے بھر باہر بٹھادیا گیا۔ پہلے ایک اور قیدی کو پیش کیا گیا۔ وہ میرے ہی گاؤں کا تھا۔ اس نے تار کاٹے تھے اس پر اسے سزا ہو گئی تھی۔ میں سوچنے لگا اسے آج پھر کیوں عدالت کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔ یہ تو جان بوجھ کر پریشان کرنا ہوا۔ اس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اسے خاص مقصد کے تحت فوجی عدالت کے سامنے لے جایا گیا تھا۔ اسے یہ جھوٹی گواہی دینی تھی کہ اسے تار کاٹنے پر میں نے اکسایا تھا۔ اس کے منہ سے یہ بھی کہلوانا چاہتے تھے کہ سارا پلان میں نے ہی بنایا تھا۔ اسے یہ لالچ دیا گیا تھا کہ اگر وہ یہ سب کچھ کہہ دے گا تو اسے صرف دو سال کی سزا ہوگی۔ لیکن ان کا یہ کام پورا نہ ہوا۔ بھلا کوئی میری مخالفت کیوں کرتا۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ اس قیدی کو کئی لالچ دیے گئے۔ قید تھی بھی تو کتنی کڑی۔ جہاں ایک ایک دن کاٹنا دوبھر تھا وہاں دو سال کاٹنا کتنا کٹھن تھا۔ پر اس قیدی نے یہ مشقت قبول کی اور میرے خلاف گواہی دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد جب میری پیشی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اندر تین انگریز بیٹھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے طرح طرح کے سوالات پوچھنے شروع کر دیے۔ ایک نے پوچھا "تم سرکار کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے ہو؟" میں نے فوراً جواب دیا، "جن لوگوں کے پیچھے میں گھومتا ہوں وہ سب سرکار کے وفادار خادم ہیں" اس کے بعد کچھ نہیں پوچھا گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے قید خانہ واپس لے جایا گیا۔ مجھے ایک بیرک میں بند کر دیا گیا۔ وہاں پہلے ہی بہت سے پٹھان بند تھے۔ ان سب کا قصور یہی تھا کہ وہ اپنے وطن سے پیار کرتے تھے۔ وہ سب ایک ساتھ قید تھے۔

"ایک دن میرے والد اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ آئے۔ انھیں دیکھ کر میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ گاؤں میں یہ افواہ پھیلی تھی کہ مجھے پھانسی دی جاچکی

ہے۔ اس وجہ سے والد صاحب بہت غمگین تھے۔ خلاف امید مجھے زندہ دیکھ کر ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ بولے "بیٹے تمہیں دوسری زندگی ملی ہے"۔

خان صاحب کے آبائی گاؤں اتمان زئی کی اپنی کہانی ہے۔ یہاں ایک دن اچانک فوج آ پہنچی اور سارے گاؤں کو گھیر لیا گیا۔ گاؤں کے لوگوں کو لالا کر مدرسے کے احاطے میں جمع کر لیا۔ فوج کے ہمراہ توپیں بھی تھیں۔ انھوں نے توپوں کے دہانے ان کی طرف کر دیے اور توپوں پر چڑھ گئے۔ اور توپوں سے ایسی آوازیں نکالنے لگے جیسے توپ داغنے سے پہلے نکلتی ہے۔ لوگوں کو لگا جیسے ان سب کو توپوں سے اڑا دیا جائے گا۔ یہ سب اس مقصد سے کیا جا رہا تھا تاکہ وہ خوفزدہ ہو جائیں۔ سب نے قرآن کی آئتیں پڑھنی شروع کریں۔ پھر لوٹ مار شروع ہوئی۔ لوگوں کی جانیں تو ضرور بچ گئی تھیں لیکن ان کے دلوں پر ڈر بیٹھ گیا تھا۔ پورے گاؤں پر تیس ہزار روپیوں کا اجتماعی جرمانہ ہوا اس پر بھی انگریزوں کو چین نہیں ملا۔ تیس ہزار کے بجائے وہ لوگوں سے تقریباً ایک لاکھ لے گئے۔ کئی معصوم لوگوں پر ظلم ڈھائے۔ ایک سو پچاس کو جیل بھیج دیا۔ کچھ کو یہ کہہ کر بند کر رکھا کہ جب تک جرمانہ ادا نہ کریں گے آزاد نہیں کیے جائیں گے۔ اکثر پٹھانوں کو بندی بنایا گیا، جھوٹی گواہی دینے پر مجبور کیا گیا لیکن تب بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک خان پولیس والوں کے ساتھ مل گیا تھا۔ اس نے اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ غداری کی۔ ایک ایک فرد سے تین تین بار جرمانہ وصول کیا گیا۔

جب تاوان (جرمانہ) ادا کر دیا گیا تو 100 اشخاص کو رہا کر دیا گیا۔ آہستہ آہستہ کچھ اور لوگ بھی چھوڑ دیے گئے۔ 6 ماہ تک غفار خان کو قید رکھا۔ مدت پوری ہونے پر انھیں آزاد کر دیا گیا۔ ایذائیں اور مشقتیں ایک طرح سے زندگی کی آزمائشیں ہوتی ہیں یہ وہ بھٹی ہوتی ہے جس میں تپ کر سونا نکھر اٹھتا ہے۔ انجام کار خان صاحب کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔

انگریزوں نے تشدد اور دباؤ کی پالیسی اختیار کی ہوئی تھی لیکن لوگوں نے کندھے سے کندھا ملا کر اس کا سامنا کیا۔ مل جل کر مقابلہ کرنے کے لیے وہ بیٹھکیں کرتے۔ اس سے وہ ایک دوسرے کے اور قریب آئے خوشی یا غم کا کوئی بھی موقع ہوتا وہ جمع ہو جاتے۔ ملک اور قوم کی باتیں کرتے۔ انگریزوں کو اکھاڑ پھینکنے کی یوجناؤں پر غور ہوتا۔ ان کے مظالم کی داستانیں سن کر وہ غصے سے کھولنے لگے۔

تب تک بغاوت نے اچھی طرح سے جڑیں جمالی تھیں۔ خلافت تحریک شروع ہو چکی تھی۔ خلافت کمیٹیاں بنیں اور تنظیمیں تشکیل دی گئیں۔ اس سے لوگوں میں خود اعتمادی پیدا ہوئی وہ آگے آئے نئے نئے منصوبے بننے لگے۔ سب کے دلوں میں ایک ہی جذبہ موجزن تھا "انگریز ہمارے دشمن ہیں۔ جان کی قیمت دے کر بھی ان کی مخالفت کرنی ہے"۔

غفار خان جب جیل میں تھے تو ان کی دوسری سگائی ہو گئی تھی کیونکہ ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ دوسری شادی کرلیں۔ اس لیے وہ اپنے دوست عباس کے ساتھ جب پیشاور جارہے تھے تو راستے میں انھیں پولیس نے دوبارہ دھر لیا اور واپس لے آئی، چالان ہوا اور پیشاور لے جائے گئے۔ وہاں کے پولیس آفیسر کا نام مسٹر شارٹ تھا۔ خان صاحب کو اس کے بنگلے کے باہر کھڑا کر دیا گیا۔ شام کا وقت تھا۔ اف! دسمبر کے مہینے کی وہ شام! کڑا کے کی سردی پڑ رہی تھی۔ اس کڑا کے کی سردی میں وہ اپنے دوست عباس اور سپاہیوں کے ساتھ کھڑے رہے۔ ادھر انگریز افسر مزے سے آگ تاپ رہا تھا۔ خان صاحب اس بات پر حیران تھے کہ اس بار انھیں گرفتار کیوں کیا گیا تھا؟ کیا پوچھنا چاہتے تھے یہ لوگ؟ اور جواب میں انھیں کیا کہنا چاہیے۔

عباس نے غفار خان کو جھنجھوڑ دیا۔ غفار بولے "دیکھو جھوٹ مت بولنا۔ سب کچھ سچ سچ بتا دینا"۔

آدھی رات کے بعد شارٹ نے انھیں اندر بلوایا۔ وہ افسر بہت سخت، اڑیل اور ضدی تھا۔ انہی دنوں نوشیرہ بم پھینکنے کی واردات ہوئی تھی۔ ان دونوں کو اسی سلسلے میں گرفتار کیا گیا تھا۔ شارٹ نے جب ان سے سوال کیا تو خان صاحب نے تڑاخ سے جواب دیا تو شارٹ بولا "آہستہ بولو" جب غفار خان نے دھیرے سے بولنا شروع کیا تو وہ چیخا "زور سے بولو" اس پر غفار خان زور سے بول اٹھے۔ "زور سے بولتا ہوں تو کہتے ہو دھیرے بولو، دھیرے بولوں تو زور سے بولنے کے لیے کہتے ہو۔ پہلے ہمیں بولنے کا طریقہ سمجھا دو"۔

شارٹ کے سامنے اس لہجے میں بولنے کی اس سے پہلے کسی نے ہمت نہیں کی تھی۔ سو وہ آگ بگولہ ہو اٹھا اور انھیں صدر تھانے میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔

اس رات انھیں انگریز افسر کے سامنے بولنے کی سزا بھی ملی۔ رات بھر بھوکا رکھا گیا۔ الگ کوٹھری دی گئی۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ سیمنٹ کے ٹھنڈے فرش پر پیر جمے جا رہے تھے۔ کوٹھری چاروں طرف سے بند تھی۔ کونے میں کچھ گلے سڑے کمبل پڑے ہوئے تھے جس میں جوئیں بھری پڑی تھیں ان سے بڑی بدبو آ رہی تھی۔ ادھر سردی سے ناک میں دم تھا۔ مجبوراً انھیں وہی کمبل اوڑھنے پڑے۔

صبح اٹھے تو سارے کپڑے جوؤں سے بھر پڑے تھے۔ ایسی حوالات میں انھیں ایک ہفتہ رہنا پڑا۔ دوبارہ جب ان کی پیشی ہوئی تو وہ پھٹ پڑے بولے "آخر مجھے یہ بتایا جائے کہ مجھے کس قصور میں گرفتار کیا جا رہا ہے؟"

فرنگی نے کہا "میں تفتیش کر رہا تھا"۔

غفار بولے "کیا جانچ گرفتاری سے پہلے نہیں کی جا سکتی تھی؟

وہ چلایا "میری مرضی۔ میں کسی کی گرفتار کرنے سے پہلے جانچ کروں یا کروں

ہی نہیں اور اسے حوالات میں بند رکھوں"۔

غفار خان بھی تیز آواز میں بولے "آخر میں بھی انسان ہوں۔ میری طرف دیکھو میری شخصیت دیکھو مجھے بے سبب ایذا کیوں پہونچائی گئی؟ میں کہیں بھاگا جا رہا تھا پہلے تفتیش کر لی ہوتی تب ہی گرفتار کرتے۔ میری شخصیت تو دیکھو"۔

اس نے روکھے پن سے کہا "تم ہو کیا؟" اور انھیں آزاد کر دیا۔ وہ گاؤں گئے دل بہت دکھا ہوا تھا۔ انگریزوں کے مظالم میں دن بدن اضافہ ہو تا جا رہا تھا۔

1920ء غفار خاں کی دوسری شادی ہوئی ادھر خلافت کمیٹیاں بن رہی تھیں جلسے جلوسوں میں شامل ہونے والوں پر انگریز بہت ظلم کرتے ہر کوئی توبہ مانگ جاتا۔ غفار خان صاحب نے دیکھا کہ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ جو اسکول کھولے جاتے یا تو گرا دیے جاتے یا بند کروانے پڑتے۔ جو بات ان کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی وہ تھی زبان۔

ایک بار محمود طرزی نے جو افغانستان کے وزیر خارجہ تھے ایک بڑی دعوت دی۔ وزیر خارجہ بے حد ذہین اور لائق انسان تھے ۔انہوں نے غفار خان کو بھی کھانے پر بلایا۔ دعوت میں بہت سے دانشور بھی موجود تھے۔ وہیں زبان کے مسئلے پر گفتگو چل پڑی۔

طرزی نے کہا "ہمارے لوگ فارسی بھی بولتے ہیں اور پشتو بھی" غفار بولے "پشتو تو افغانستان کی قومی زبان ہے۔ ہم تو کسی کو فارسی بولنے سے نہیں روکتے۔ انگریز جب ہندوستان آئے تو وہ یہاں کی ایک زبان بھی نہیں جانتے تھے اور نہ ہی ہندوستانیوں کو ان کی زبان آتی تھی۔ لیکن انہوں نے کمال کر دیا۔ یہاں کی کوئی زبان نہیں اپنائی اپنی ہی زبان کو سرکاری زبان بنادیا اور کروڑوں لوگوں نے وہ زبان سیکھ لی۔ پھر یہ زبان سب پر حاوی ہو گئی۔ اگر افغانستان کی راشٹر بھاشا پشتو اپنے ملک میں رائج ہوتی اور اسے قومی زبان بنایا گیا ہوتا تو آج آپ کے ملک میں ایک شخص بھی ایسا نہ ہوتا جو پشتو نہ سمجھتا۔ اگر لوگ اپنی زبان

جانتے تو ملک اور ترقی کرتا۔ کسی بھی قوم کی ترقی ہوتی ہے اس کی زبان سے ہی۔ زبان سب کو ایک دوسرے سے باندھتی ہے۔

خاندان کے بیچ

یہی عہد غفار خاں نے لیا۔ انہوں نے تعلیم کی تشہیر اور اشاعت کا بیڑا اٹھالیا۔

لاہور میں خلافت تحریک شروع ہوئی۔ وہیں ان کی ملاقات بتو گاؤں کے امیر مختار سے ہوگئی۔ ان کے دو بیٹے اسکول چلاتے تھے ان کے بھائی ممتاز خان اس اسکول کے پرنسپل مقرر ہوگئے۔ یہ اسکول غفار خان کو سونپ کر وہ پیشاور چلے گئے۔ غفار خان کو تو جیسے منہ مانگی مراد مل گئی انہوں نے دل لگاکر کام کرنا شروع کر دیا۔

وہ کئی طرح کی تبدیلیاں عمل میں لائے۔ انگریزوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ ان کے اسکول میں جو مدرّس بھی آتا انگریز اسے ڈرا دھمکا کر بھگا دیتے جب ٹیچر ڈرانے دھمکانے میں نہ آتے تو انھیں زیادہ تنخواہ کا لالچ دیا جاتا، پریشان کیا جاتا، تنگ کرنے کے نئے نئے طریقے تلاشے جاتے۔ غفار خاں نے لوگوں کی ہمت بڑھائی اور ان میں اعتماد پیدا کیا۔

وہ خود گھوم گھوم کر لوگوں کو انگریزوں کی زیادتیوں کے بارے میں آگاہ کرتے۔ ان کی پھوٹ ڈالنے کی اسکیموں سے جانکاری کرانے۔ بار بار اسکول بند کرانے کا سبب بتاتے، وہ بتاتے کہ انگریز چاہتے ہیں کہ لوگوں میں بیداری نہ آئے، وہ اپنے حقوق کا مطالبہ نہ کریں تاکہ انگریز بے روک ٹوک حکومت کرتے رہیں۔

یہ اسکول ابھی چھ ماہ بھی نہیں چلا تھا کہ صوبہ کے چیف کمشنر نے عبدالغفار خان کے والد کو بلوا بھیجا۔ اس نے ان سے کہا" دیکھو جب کہ سب لوگ آرام سے بیٹھے ہیں تمہارا بیٹا گاؤں گاؤں گھوم رہا ہے۔ اس سے کہو کہ چین سے گھر بیٹھے ورنہ اس کے لیے اچھا نہ ہوگا"۔

غفار خان کے والد صاحب گھر لوٹے تو بہت پریشان تھے انہوں نے غفار خان کو الگ لے جاکر ساری روداد سنادی اس کے بعد بولے" میری رائے میں تم بھی آرام سے بیٹھ جاؤ"۔

غفار اپنے والد کی اس بات سے پریشان ہوئے پر خیال آیا کہ انگیریز تو باپ بیٹے کے بیچ میں ناچاقی پیدا کر رہے ہیں۔ انہوں نے عاجزی کے ساتھ کہا" اگر یہ سب لوگ نماز

نہ ادا کرنے کو کہیں تو کیا آپ مجھے نماز ادا نہ کرنے کے لیے کہیں گے ؟"۔

والد صاحب فوراً بولے "واہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے نماز تو فرض ہے"۔ غفار بولے "جس طرح نماز ایک فرض ہے بالکل اسی طرح تعلیم کی تبلیغ اور قوم کی خدمت بھی لازمی فرض ہے"۔ یہ سن کر والد صاحب نے سنجیدگی کے ساتھ کہا

"ہاں یہ فرض ہے" اس کے بعد والد صاحب نے لاٹ صاحب سے کہلوا بھیجا "صاحب بہادر! ہم آپ کے لیے اپنا مذہب نہیں چھوڑ سکتے" چند روز بعد ہی غفار خان کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا انہیں ضمانت پر چھوڑا جا سکتا تھا پر خان صاحب نے منظور نہیں کیا۔ تین سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ ان دنوں کی جیل بھی انوکھی تھی۔ کھانا اتنا خراب کہ اسے کھانا کہنا بھی مناسب نہیں تھا۔ کپڑے بھی کپڑوں جیسے نہیں ہوتے تھے۔ ایسی حالت میں خان صاحب جیسے تندرست لمبے اونچے شخص کو کتنی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ جو شلوار دی گئی وہ آدھی پنڈلیوں تک ہی آپاتی۔ قمیص کمر کے اوپر تک۔ شلوار اتنی تنگ کہ ساری پھٹ گئی تنہا کوٹھری اسی میں قید۔ بیس سیر اناج پیسنے کو دیا جاتا پیروں میں بیڑیاں پہنائی جاتیں۔ گلے میں لوہے کا طوق ڈالا جاتا ایک چھوٹی سی لکڑی کی تختی ان کے گلے میں لٹکادی جاتی اس پر قیدی کے جرم کی دفعہ اور قید کی مدت تحریر کی ہوئی ہوتی تھی۔

اس قید خانہ کا ایک داروغہ ہندو تھا۔ وہ بہت ایماندار تھا اس میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس نے انہیں کوٹھری میں تو بند کر دیا پر چکی نہیں پیسنے دی۔ پیروں میں بیڑیاں بھی نہیں ڈالیں۔ جیل کی روٹیاں تو دیتا لیکن دوسری روٹیوں سے بہتر ہوتیں دال اور ساگ بھی اور قیدیوں سے زیادہ اچھا ملتا۔

انھیں تین کمبل اور ایک بوری جیسا ٹاٹ دیا گیا لیکن ٹھنڈ اتنی تھی کہ اس میں

گذارہ کرنا دشوار تھا۔ کبھی کبھی کوئی جمادار آتا تو دھوپ سینکنے دیتا۔ رات بھر انہیں نیند نہ آتی کیونکہ ہر تین گھنٹے بعد پہرے دار کی ڈیوٹی بدل جاتی۔ ایک کے بعد دوسرا پہریدار آتا، دروازہ کھٹکھٹاتا، تالے دیکھتا پھر آواز لگاتا "بول بھائی" جب تک اسے جواب نہ مل جاتا وہ وہاں سے نہ ٹلتا۔ اگر قیدی آواز دینے میں دیر کرتا تو تازہ مصیبت کھڑی ہو جاتی دوسرے دن اسے اور سزا ملتی۔

غفار خان کو جب پیشاور کی جیل میں بھیجا گیا تو انھیں جیل خانہ کی قصوری چکی میں بند کر دیا گیا۔ جب وہ چکی کے اندر گئے تو بدبو سے ان کا برا حال ہو گیا، اندر پاخانہ سے بھرا ہوا مٹی کا برتن پڑا تھا انہوں نے جیل کے ادھیکاری سے کہا "چکی بہت گندی ہے" لیکن وہاں سننے والا کون تھا؟

غفار خان اور ان کے بے شمار ساتھی ایسی ہی چکیوں میں بند تھے روٹی بھی دی جاتی تھی تو سلاخوں سے۔ چکیوں کے دروازے تب کھلتے جب کبھی صفائی کرنے آتے یہاں ان پر دوہرا پہرہ تھا۔ نہ کوئی پاس پھٹک سکے اور نہ کوئی باہر آسکے۔ اتنے زیادہ مظالم کو دیکھتے ہوئے آخر کار ضمانت کی عرضیاں بھر دی گئیں۔ سب کو رہا کر دیا گیا پر غفار خان تو ظلم کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے انہوں نے ضمانت پر چھوٹنے سے انکار کر دیا۔ انگریز افسر سے ذرا سی بھی بات کا مطلب تھا قید کی میعاد کا اور زیادہ بڑھنا۔ ڈپٹی کمشنر جب وہاں آئے اور غفار خان کو دیکھا تو غصے سے کہا "اسے یہاں داخل کیوں کیا گیا"۔

غفار خان تیز لہجے میں بولے "افسوس تو اس بات کا ہے کہ ایک تو آپ نے ہم سے ہمارا ملک چھین لیا دوسرے اب اس میں ہمیں رہنے بھی نہیں دیتے۔ غفار خان کا یہ کہنا تھا کہ انگریز افسر آگ بگولہ ہو گیا۔

"جاؤ اسے تین سال کی قید بامشقت دے دی" انھیں پھر جیل ہو گئی۔ وہ دن تھے جب قیدیوں کے لیے اپنے پاس کھانے کی کوئی چیز رکھنا جرم تھا۔ تب ہی گاؤں کا ایک نمبر دار آکر انھیں گڑ کی دو ڈلیاں دے گیا۔ جب ہی جیلر کے آنے کی اطلاع ملی، وہ گڑ چھپانا چاہتے تھے۔ کمبل کے نیچے چھپا ہی رہے تھے کہ خیال آیا اگر جیلر نے دیکھ لیا تو؟ خیر کسی طرح گڑ چھپا ہی لیا۔ تلاشی ہوئی۔ گڑ کا پتہ نہیں چل پایا وہ سانس روکے کھڑے رہے۔ جب جیلر چلا گیا تو انہوں نے گڑ باہر پھینک دیا اور عہد کیا کہ جیل میں کوئی ایسا کام نہ کروں گا جو جیل کے قوانین کے خلاف ہو۔ ایسا کرنے سے ان کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ خوف سے چھٹکارا پانے کا ایک ہی علاج ہے کوئی غلط کام نہ کرو۔ دل میں تناؤ بھی نہ رہے گا۔ گڑ چھپاتے ہوئے وہ دوبارہ یہی عہد کر رہے تھے کوئی دوسرا ہوتا تو شاید جیلر کے جاتے ہی گڑ منہ میں ڈال لیتا لیکن غفار خان نے ایسا نہیں کیا۔ ایسے ہی لمحوں میں عہد مضبوط ہوتے ہیں۔ غفار خاں نے پکا عزم کیا۔

غفار خان کے پاس روز پیغام آتے۔ ان کے سامنے بہت سی تجاویز آتیں۔ ان کے مضبوط ارادے شاید اب جیل کے افسران کو ہلا رہے تھے انہیں لگا کہ غفار خان کو مزید جیل میں رکھنا اور کوئی گل نہ کھلا دے۔ ان کے پاس تجویز آئی "اسکول بیشک کھول لو لیکن اپنے دورے بند کر دو۔ اگر دوروں پر نہیں جاؤ گے اور لوگوں کو نصیحت کرنا بند کر دو گے تو تم جیل سے رہا کر دیے جاؤ گے"۔

تجویز بہت اچھی تھی اور کوئی ہوتا تو ضرور مان لیتا۔ جیل میں رہنا بہت بڑی سزا تھی جیل میں روز بروز تکلیفیں بڑھتی جا رہی تھیں گندے کمبل، تنگ کوٹھری جہاں دھوپ کی کرن بھی نہیں آسکتی تھی ایک ایک پل پہاڑ سا ہو رہا تھا۔ پھر ایسے میں وہاں سے رہا ہونے

کالالچ کسے نہیں تھا لیکن غفار خان کو جیسے تکلیفوں سے پیار ہو گیا تھا۔ وہ ان سے تب تک پیچھا نہیں چھڑانا چاہتے تھے جب تک وہ دیس سے پوری طرح کوچ نہ کر جائیں۔ انھوں نے حکومت کی یہ تجویز ٹھکرادی اور اپنی اس کوٹھری میں ہی ملک کی آزادی کا تانا بانا بننے لگے۔

غفار خان کی شخصیت اور برتاؤ سے سب ہی متأثر ہو جاتے تھے وہ ان کی مدد کرنا چاہتے تھے اور طریقے بھی بتاتے لیکن ان کا دل نہ مانتا انہوں نے دیکھا کہ اخلاقی مجرم اور دیس سیوک سب ایک ہی چکی میں پس رہے تھے انگریزوں کے لیے دونوں برابر تھے کھانا اتنا خراب ہوتا تھا کہ اسے جانور بھی نہیں کھا سکتا تھا لیکن انھوں نے عزم کر ہی لیا تھا انھیں نہ کسی چیز کا لبھاؤ تھا اور نہ کسی دھمکی کی پرواہ۔

کچھ ہی دنوں بعد انھیں کارخانے میں لفافے بنانے کے لیے بھیج دیا گیا۔ وہ قیدی جو محنت سے ڈرتے تھے بیکار پڑے رہتے ان کے لیے جیل میں رہنا بہت دشوار تھا۔ ادھر غفار خاں کو غازی خان جیل خانہ بھیجا گیا۔ پاؤں میں بیڑیاں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں جس گاڑی میں انھیں بٹھایا گیا چاروں طرف پردے تھے پھر نوکروں کے ساتھ تانگے میں بٹھادیا ان پر سخت پہرہ لگادیا۔ ان سے کوئی مل نہیں سکتا تھا۔

جیل کے ذمہ داران بھی پٹھان تھے۔ جب وہ غفار خان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے تو ان کا دل بغاوت پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ تب ہی ایک ہندو افسر آگیا اس نے آکر ان کی بیڑیاں کھول دیں اور ان کی ساری ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔

ادھر جیل میں گندی غذا سے ان کے دانت خراب ہو گئے اور وہ پائیریا میں مبتلا ہو گئے۔ ادھر بیڑیاں بھی ٹھیک ناپ کی نہیں ملتی تھیں وہ زخمی تو تھے لیکن اس طرح کی چھوٹی موٹی تکلیفیں کہاں کسی کو اپنے راستے سے ہٹا سکتی ہیں۔

ایک مزیدار قصہ غفار خان نے سنایا

"دانتوں کا ڈاکٹر جب میرے دانت دیکھنے آیا تو اس نے بڑی توجہ سے میرے دانت دیکھے۔ دو تین دانت نکال دیے باقی صاف کر دیے۔" غفار خان دانتوں کی وجہ سے پریشان تھے اب انھوں نے چین کی سانس لی۔ ڈاکٹر کو فیس دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا پر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے بار بار روپے دینے کی کوشش کی تو اس نے کہا "آپ نے کوئی جرم نہیں کیا آپ قوم کے لیے اتنی قربانی دے رہے ہیں جس میں آپ کو اتنی تکلیف سہنی پڑ رہی ہے۔ آپ کے پاس مال دولت ہے اچھی زندگی ہے اسے ٹھکرا کر ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ کو اپنی پرواہ نہیں دیس کے لیے آپ اتنی قربانی دے سکتے ہیں۔ آپ جیسے محب وطن سے میں فیس نہیں لوں گا۔ کیا میں اتنا ایثار بھی نہیں کر سکتا؟ آپ کی تھوڑی سی خدمت کرنے کا مجھے موقع نصیب ہوا کیا اس کی فیس لوں میرے لیے اس سے بڑھ کر شرم کی اور کیا بات ہو گی؟"

غفار خان نے روپے واپس رکھ لئے۔ ڈاکٹر کی خوش اخلاقی سے وہ بہت متاثر ہوئے وہ جیسے پیسے نہ لے کر انھیں بے مول خرید لے گیا۔ آج بھی وہ اسے بھول نہیں پائے۔ اس کی آنکھوں میں محبت تھی، ایک مدت کے بعد انھوں نے کسی کی نظروں میں ایسا پیار دیکھا تھا۔ جس جیل میں وہ تھے وہاں تین ماہ میں ایک خط لکھنے کی اجازت ملتی تھی۔ غفار خان جلدی سے قلم سنبھال کر ماں کو خط لکھنے لگے۔ ان کی والدہ انھیں ہمیشہ یوں جیل میں پا کر بہت اداس رہنے لگیں تھیں۔ ان سے ملنے کے لیے وہ بے چین رہتیں ان کا بس چلتا تو وہ ان سے ملنے کے لیے جیل جاتیں پر وہ بوڑھی تھیں۔ ڈیرہ غازی خاں بہت دور تھا۔ آنا ممکن نہ تھا۔ تکلیف دہ سفر وہ کر نہیں سکتی تھیں اس کے علاوہ راستے میں دریائے سندھ پڑتا تھا اس

لیے وہ اپنی والدہ کو خط لکھتے، خط بھی دیس سیوا کی باتوں سے ہی بھرا ہوتا جیل کی تکالیف کا وہ بھول کر بھی ذکر نہ کرتے۔

ان کی والدہ کو ہر وقت غفار خان کی فکر ہی ستاتی رہتی۔ وہ جب انگریزوں کے مظالم کی داستانیں سنتیں تو انھیں لگتا کہ غفار خان بھی ایسی ہی تکلفیں اٹھا رہا ہوگا۔ انھوں نے اپنے بیٹے سے ملنا چاہا لیکن وہ جانتے تھے کہ یہاں کے خراب حالات دیکھ کر وہ بہت دکھی ہوں گی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی یہ جانے کہ ان کی ہر گھڑی کس مصیبت میں بسر ہو رہی ہے۔ پھر وہ ماں جس کا بیٹا قید میں ہو جسے وہ اپنے سے علاحدہ نہیں کرنا چاہتی تھیں جسے انھوں نے انگلینڈ جاتے جاتے روک لیا تھا اب بھی ہر وقت دور ہی رہے انھوں نے بیٹے سے ملنا چاہا لیکن غفار خان نے خط میں لکھ دیا۔

"اب میں جلد ہی چھوٹ جاؤں گا اور اپنی پیاری ماں سے ملوں گا۔ آپ یہاں مت آیئے، راستہ ٹھیک نہیں راہ میں دریائے سندھ پڑتا ہے آپ کو آنے میں تکلیف ہوگی میں تو آ ہی رہا ہوں قید خانہ میں مجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں"۔

ماں نے بیٹے کے خط کو چھاتی سے لگا لیا لیکن وہ اندر ہی اندر ٹوٹتی جا رہی تھیں۔ غفار خان سے انھیں بے انتہا محبت تھی انھیں وہ نظروں سے دور کرنا نہیں چاہتی تھیں لیکن دیس کی سیوا میں وہ سب کچھ قربان کر سکتی تھیں۔ اپنے بیٹے کو انھوں نے ایثار اور ریاضت کا سبق دیا تھا انھیں خودداری اور عزت نفس کے لیے مر مٹنے کی تعلیم دی تھی۔ وہ بیٹے کو کیسے روک لیتیں۔ اسے جلسوں اور جلوسوں میں تقریریں کرنے سے کیسے باز رکھتیں۔ غفار خان کے باپ نے بھی بیٹے کو ہمیشہ یہی سکھایا تھا "وطن کے لیے جان قربان کر دو یہ چھوٹی موٹی تکلیفیں جسم کو دکھ ضرور دیں گی لیکن خوفزدہ مت ہونا۔ والدین کی یہ

تعلیمات غفار خان کے ہمیشہ ساتھ رہیں۔

ان کی والدہ بیمار پڑیں لیکن کسی نے غفار خان کو اطلاع نہیں دی بخار میں بڑبڑاتی تھیں "غفار میرا غفار آیا کہ نہیں، ارے کدھر گیا غفار آ نا بیٹا! وہ آگیا، آگیانا"۔

ایسی آوازوں میں وہ اپنے بیٹے کو پکارتی رہیں۔ غفار خان کو جیل میں جانے کیسا لگنے لگا۔ دل کچھ اچاٹ سا ہو رہا تھا۔ وہ یہ تو نہیں جانتے تھے کہ انھیں پکارتے پکارتے ان کی پیاری ماں آخری سانسیں لے رہی ہے۔ آخر ایک دن ان کا انتقال ہو گیا۔ کسی نے انھیں اطلاع نہیں دی لیکن ان کے جی کو ایسا لگا جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔

اخباروں میں ان کی والدہ کی موت کی خبر شائع ہوئی۔ غفار خان جیل میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ ماں سے ملنے کو وہ تڑپ رہے تھے یہی تڑپ ماں کے دل میں بھی تھی لیکن ملاقات نہیں ہو سکی۔ غفار خان کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ بس ایک بار ماں کی چھاتی سے لپٹ کر رو لیتا۔ لیکن ہونی کے سامنے ہم سب کتنے بے بس ہیں اس کے سامنے ہر کسی کا سر جھک جاتا ہے۔

غفار خان جیل سے چھوٹ کر جب گھر پہنچے تو ان کی بہن نے ماں کی آخری حالت سنائی تو غفار خان کو ایسا لگا کہ جیسے وہ آوازیں ٹھہر سی گئی ہوں کوئی اب بھی بلا رہا ہے۔ لیکن وہ جائیں بھی تو کہاں لپٹ لپٹ کر روئیں بھی تو کس سے۔ وہ پیار کا سایہ تو ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ ایک بار بھی تو واپس آکر نہیں مل سکتا تھا۔ غفار غفار کہتے کہتے ان کی روح پرواز کر چکی تھی۔

1924ء میں قید کی میعاد ختم ہو گئی۔ داروغہ نے انھیں پیشاور بھجوا دیا۔ پیشاور کی پولیس نے انھیں گاؤں بھیجنے کا بندوبست کیا۔ انھیں موٹر میں بٹھا دیا گیا پر تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ موٹر پنکچر ہو گیا اب تانگے کی سواری شروع ہوئی۔ گاؤں کے پاس لے جا کر

انھیں چھوڑ دیا گیا انھوں نے دیکھا وہاں کے اسکول میں تب ہی چھٹی ہوئی تھی ان سب نے غفار کو دیکھا تو بھاگے بھاگے آئے بچوں بڑوں نے انھیں گھیر لیا۔ انہوں نے بچوں کو پیار کیا اور ان سے میٹھی میٹھی باتیں کیں۔

گاؤں والوں نے انھیں اچانک دیکھا تو حیرت میں پڑ گئے ان کی جانکاری کے مطابق انھیں تین دن بعد آنا تھا۔ سب ہی نے ان کے بھرپور استقبال کی تیاری کر رکھی تھی۔

غفار خان نے لوگوں کے جوش و خروش اور استقبال کی تیاریوں کا حال بتایا۔

"ان دنوں سب نے میرے سواگت کی خوب تیاریاں کر لی تھیں۔ وہ سب اٹک پر آنے کی سوچ رہے تھے وہاں سے مجھے ایک جلوس میں لانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گھوڑوں کا انتظام کیا جا چکا تھا۔ پر سرکار یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی اس لیے اس نے ہمیں پہلے ہی رہا کر دیا اور ہم بغیر جلوس کے دہاں پہنچے۔ہاں تانگے پر تو گئے ہی تھے گھوڑے پر سوار نہیں ہوئے تو کیا؟"۔

ایک مسکراہٹ غفار خان کے ہونٹوں پر آ گئی تاریخ اپنے صفحات کھول رہی تھی ایک ایک واقعہ اتنا توانا اتنا جاندار کہ لگتا تھا ابھی ابھی وقوع پذیر ہوا ہو۔

غفار خان نے تعلیم کی اشاعت کا جو بیڑا اٹھایا تھا وہ کامیاب ہو رہا تھا۔ تین سال کی قید کے بعد لوٹے تو اسکول دیکھنے گئے وہ ٹھیک چل رہا تھا۔ تعلیم کا پورا انتظام تھا۔ گاؤں کافی ترقی کر چکا تھا۔ محسوس ہوتا تھا جیسے بیداری کی لہر آ گئی ہو۔ سارا گاؤں پہلے سے زیادہ مستعد اور زیادہ بیدار تھا علم کی روشنی سے منور۔

انھیں دنوں اسکول کا سالانہ جلسہ ہوا۔ ہزاروں لوگوں کا مجمع تھا۔ بہت سی نظمیں پڑھی گئیں۔ حب الوطنی سے بھرپور نظمیں، پرجوش ماحول تھا جوشیلی تقریریں ہوئیں اور

انھیں "فخر افغانستان کے لقب سے نوازا گیا۔ سب نے ان سے تجربات بیان کرنے کی درخواست کی۔ غفار خان نے سوچا۔ مصیبتوں اور تکلیفوں کی کہانیاں تو وہ سن ہی چکے تھے انھیں کچھ ایسی نئی باتیں بتائی جائیں جس سے اپنی قوم اور افتخار کو پہچان سکیں انھوں نے اس بھرے مجمع میں شیر کے بچے کی کہانی سنائی۔۔۔

"بات بہت پرانی ہے۔ایک شیرنی نے بھیڑوں کے ریوڑ پر حملہ کر دیا۔ وہ حاملہ تھی وہیں اس کے بچہ پیدا ہوا لیکن وہ خود چل بسی۔ اس کے اس ننھے بچے کو بھیڑوں نے اپنے بچوں کے ساتھ پال پوس کر بڑا کیا۔ شیر کا بچہ بھیڑوں کے ساتھ گھومتا پھرتا۔ ایک دن ایک شیر نے بھیڑوں پر حملہ کیا تو وہ بھیڑوں میں شیر کے بچے کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اس نے اسے بھیڑوں سے علاحدہ کیا اور اسے دریا کے کنارے لے گیا تاکہ پانی میں اپنا منہ دیکھ سکے اور اسے پتہ چلے کہ وہ بھیڑ نہیں شیر ہے"۔

"شیر کے بچے نے اپنی شکل دیکھی تو وہ زور زور سے دہاڑنے لگا۔ سارا جنگل کانپ اٹھا۔ بھیڑیں بھاگ کھڑی ہوئیں اور جنگل کے جانوروں میں بھگدڑ مچ گئی"۔

یہ قصہ سنا کر وہ بولے "اے پختونو! میں بھی تمہیں یہ ہی بتانا چاہتا ہوں کہ تم شیر ہو۔ غلامی بری بلا ہے تم غلامی میں پلے ہو اس لیے بھیڑ بنتے جا رہے ہو۔ خود کو پہچانو تم بھیڑ نہیں ہو، شیر ہو۔ ممیں ممیں مت کرو شیر ہو شیروں کی طرح رہو۔ گرجو، دہاڑو اور دشمن کے دانت کھٹے کر دو"۔

سارا مجمع تالیوں سے گونج اٹھا۔ سب میں نیا ولولہ تھا ہر چہرہ پر روشنی کی لہر تھی۔ ہر آدمی کے بازوؤں کی مچھلیاں سرکار سے لوہا لینے کے لیے پھڑک رہی تھیں۔ ان کی تقریر کا ڈھنگ بھی متاثر کرنے والا تھا۔ ان کی بھاری آواز اور لہجہ دل پر اثر کرتا تھا۔

ان کی پر جوش آواز نے پھر سے نئی بیداری پیدا کر دی انھوں نے اپنا رونا نہیں رویا، اپنے دکھ درد کی کہانی نہیں سنائی وہ اپنی قوم کے جیالوں سے للکار کر کہنا چاہتے تھے۔

"ہمت مت ہارو۔ اگر تم ظلم کے آگے سر جھکادو گے تو شیر سے بھیڑ ہو کر رہ جاؤ گے۔ بھیڑ چال ہی تمہاری چال ہو گی۔ ایسا مت ہونے دو" ان کا ایک ایک جملہ زندگی پیدا کر رہا تھا ہر جملے پر تالیاں گونج اٹھتیں۔ ان کی ہر بات کا جی کھول کر سواگت کیا جارہا تھا وہ ایک مثال بن گئے۔ چلتا پھرتا آدرش جس کے نقش قدم پر چلا جائے جو راہ دکھا سکے۔ جو دیس کے لیے مر مٹنے کا پیغام دینے سے پہلے خود ان بیڑیوں کو پہن چکا ہو وہی دوسروں کی رہنمائی کر سکتا تھا۔ وہ سب کے لیے مثالی نمونہ بن گئے۔

عبد الغفار خان کو ہمیشہ اپنی مادری زبان کا خیال رہتا تھا وہ چاہتے تھے کہ پشتو کو بھی اور زبانوں کی طرح اہمیت حاصل ہو۔ انھوں نے پشتو زبان میں اخبار نکالا۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ پٹھانوں میں پارٹی بندی (قبیلہ بندی) ہے۔ بہت جلد اور آسانی سے ان میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ جلدی تشدد پر اتر آتے ہیں۔ رسم ورواج دقیانوسی ہیں۔ انھیں راستے پر لانا بہت ضروری تھا۔ خان صاحب جی جان سے ان کو ترقی یافتہ بنانے میں جٹ گئے۔

1929ء میں لاہور میں کانگریس کا اجلاس ہوا تھا غفار خان بھی اس میں شامل ہوئے تھے۔ اجلاس میں عورتیں بھی تھیں۔ عورتوں کی شمولیت سب کے لیے ایک طرح کا چیلنج تھا۔ انھیں فعال (Active) دیکھ کر لوگوں میں اور زیادہ جوش پیدا ہو گیا۔

غفار خان بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گاؤں گاؤں جاتے، تقریریں کرتے، اور لوگوں کو جوش دلاتے، لوگوں کے دلوں پر انگریزوں کا خوف تھا۔ انھوں نے جس طرح قیدیوں پر ظلم ڈھائے تھے انھیں سن کر لوگوں کے دلوں پر دہشت سوار تھی۔ غفار خان نے

ان کے دلوں سے وہ خوف ودہشت دور کر دی۔ دلوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا۔ جو لوگ دہشت کی وجہ سے مفلوج ہو گئے تھے وہ بیدار ہو گئے اور سنگھرش کے لیے اپنی کمر کس لیں۔ ان کے دلوں میں آزادی کا جذبہ پیدا ہوا اپنی اور دیس کی آزادی۔ انھیں وہی خوشحالی واپس لانی تھی جو کسی بھی آزاد ملک کو میسر ہوتی ہے۔ ان کا جوش اور ولولہ دیکھنے کے لیے کچھ انگریز بھی آپہنچے تھے۔ خان صاحب نے جیسے ہر شخص پر جادو کر دیا تھا۔ اب انھیں کسی کی دھمکیاں ڈرا نہیں سکتی تھیں۔ کوئی لالچ انھیں ان کے راستے سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ سب مضبوطی کے ساتھ آگے بڑھنے کے لیے بے چین۔ سب میں برداشت کی طاقت آچکی تھی اب وہ جلدی سے مشتعل نہیں ہوا ٹھتے تھے۔ صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے اگر کہیں تھوڑی بہت نوک جھوک ہو بھی جاتی تو تشدد (ہنسا) پر آمادہ نہیں ہو جاتے۔

لوگوں میں یہ جوش دیکھ کر غفار خان کو یہ یقین ہو گیا اب وہ منظم ہو سکیں گے۔ ایک آواز ہو گی۔ سب اک ہو کر دشمن کا سامنا کریں گے۔ انقلاب کا جنم ہو رہا تھا۔ انگریزوں کو اب خطرہ نظر آنے لگا۔ غفار خان نے چار ماہ افغانوں میں لگاتار اتنا زبردست کام کیا کہ سارے صوبے میں تحریک پھیل گئی۔

تحریک (Movement) یوں آگ پکڑتے دیکھ چیف کمشنر سٹپٹا گیا اور اسے سرکاری انتظامیہ کی جڑیں ہلتی محسوس ہوئیں اسنے فوراً غفار خان کے پاس یہ پیغام بھیجا "یہ آندولن (تحریک) بند کر دو ورنہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہو گا"۔

غفار خان نے جواب میں لکھا "یہ تو ایک سماجی تحریک ہے یہ سیاسی نہیں ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا" چیف کمشنر نے کہا "تم پٹھانوں کو منظم کر کے ہمارے خلاف انھیں استعمال بھی تو کر سکتے ہو"۔

غفار خان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی چیف کمشنر کے دل میں پوشیدہ خوف سامنے آگیا تھا۔ انھیں اب خطرے کا احساس ہونے لگا تھا۔ غفار خان یہی تو چاہتے تھے۔ وہ لوگ جو بے کھٹکے انتظام چلا رہے تھے، ظلم ڈھا رہے تھے انھیں اپنے اکھڑنے کی بھنک تو مل جائے انھوں نے فوراً جواب دیا "آپ ہم پر بھروسہ کریں گے تبھی ہم بھی آپ لوگوں پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ انقلاب تو آئے گا ہی ہم تو صرف اس انقلاب کے لیے تمہید باندھ رہے ہیں"۔

عبد الغفار خان انگریزوں کے لیے خوف کا باعث بن گئے تھے۔ ان کی تقریروں سے لوگوں میں جوش بھر جاتا تھا اسلئے ان پر الزام لگا کر دوبارہ قید کر لیا گیا۔ انگریزوں نے عوام پر خوفناک مظالم ڈھانے شروع کر دیے صوبہ کے سبھی لوگوں کا گھیراؤ ہو گیا اتمان زئی کو بھی گھیر لیا گیا۔ فوجی وہاں کے دفتر پہنچے اور دفتر کے سارے اہلکاروں کو دھر پکڑا کوئی بھی بھاگ نہیں سکا۔ انھوں نے ایک ایک کو اٹھا کر پکی سڑک پر پھینک دیا۔

وہیں غفار خان کے بڑے بیٹے غنی خان بھی بیٹھے تھے اس وقت ان کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ اسکول کی چھٹی ہوتے ہی وہ دفتر میں کام کرنے کے لیے آبیٹھتے۔ وہ اپنے باپ کی طرح بہادر تھے۔ انگریزوں نے انہیں پہچان لیا اسے وہ سنگین سے مارنا چاہتے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ ان کی سنگینیوں کا شکار بنتے ایک صوبے دار نے سنگین کے آگے اپنا ہاتھ بڑھا دیا پھر غنی خاں کو سہارا دے کر آہستہ سے نیچے اتار دیا۔ فوجیوں نے دفتر کو آگ لگا دی۔ دیکھتے دیکھتے سارا دفتر جل کر راکھ ہو گیا۔ انقلابی سرخ لباس پہنتے تھے اس لیے جو کوئی لال کپڑے پہنے ہوئے تھا اسے گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں بے رحمی سے مارا پیٹا۔ ان سب کو ادھ مرا کر کے چیف کمشنر چلایا "اب بھی کوئی لال پوشاک والا باقی ہے؟"۔

چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ ہر طرف موت کا سایہ لہرا رہا تھا۔ کسی کی کچھ بھی

بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ تب ہی ایک خان نے یہ چنوتی (چیلنج) سنی وہ دوڑتا ہوا اپنے گھر گیا۔ دیگ میں لال رنگ گھولا اور اپنے کپڑے رنگ لئے اور وہ کپڑے پہن لئے۔ کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا اور چیف کمشنر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "یہ دیکھو یہ ہیں لال کپڑے، دیکھو! میں نے پہن رکھے ہیں ان سے اب بھی رنگ ٹپک رہا ہے اس رنگ میں اور بھی رنگ جائیں گے" کمشنر چپ سادھے ہکا بکا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

غفار خان کے حوصلے اور دیس بھکتی سے لوگوں میں ایسی جرأت پیدا ہوئی اور سرخ پوشی کا ایسا دور چلا کہ وہ پانچ سو سے پانچ ہزار ہوتے گئے۔ حقیقت میں یہ آندولن انگریزوں کا خود پیدا کردہ تھا۔ اس کی تشہیر بھی وہ خود ہی کر رہے تھے۔ لال کپڑوں والے (سرخ پوش) خدائی خدمتگار کہلاتے تھے۔ ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ تحریک (آندولن) زور پکڑتی گئی۔ انگریزوں کے دلوں پر خوف چھاتا جا رہا تھا انھیں اپنی بنیادیں ہلتی نظر آ رہی تھیں۔

خدائی خدمت گار مرنے مارنے پر آمادہ تھے۔ ان کا ایک نصب العین (مقصد) تھا آزادی۔ انگریز حکومت کی چنگل سے چھٹکارا۔ اس کام میں غفار خان اور ان کے سبھی بیٹے جٹ گئے تھے۔ ساری جنتا ساتھ تھی۔ غفار کے بیٹے ولی خان بھی میدان میں کود پڑے تھے۔

ترقی کے لیے کڑی محنت درکار ہے۔ اپنے مقصد میں وہی کامیاب ہوتے ہیں جو مضبوط ارادے کے مالک ہوتے ہیں۔ متحد ہو کر جب بھی بیڑا اٹھایا جاتا ہے تو کامیابی ضرور قدم چومتی ہے۔ غفار خان نے یہی کیا۔ انہوں نے انھیں آگاہ کیا کہ ہم جب بھی متحد ہونگے انگریز ہم میں پھوٹ ڈالنا چاہیں گے۔ ان سے ٹکر لینے کے لیے روحانی طاقت کی ضرورت ہے۔ ایک دوسرے پر بھروسہ کرنا ہوگا اس یقین کو ٹھیس نہ لگے اس کا خاص طور

سے خیال رکھنا ہوگا۔ ذات پات یا قبائلیت ایک دوسرے کو نیچا نہ دکھلائیں۔ ملک کو سب سے برتر مانو۔ اسی پر جان قربان کریں۔ ہم ایک ہیں۔ ایک ہو کر اگر ظلم و زیادتی کا مقابلہ کریں گے تو ان کی بنیادیں ہل جائیں گی۔

لوگوں میں نیا جوش دیکھ کر جب انگریزوں نے نئی چال چلنی چاہی تو غفار خاں نے سب کو کانگریس میں شامل ہونے کی بات کی اور سارے پٹھان کانگریس میں شامل ہو گئے اس سے انگریزوں کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ انگریزوں نے انھیں بلایا سمجھوتا کرنے کے لیے کہا اور ساری مراعات دینے کا وعدہ کیا انھوں نے یہ بھی پیش کش کی کہ وہ انھیں وہ ساری رعایتیں دیں گے جو بھارت کو ملیں۔ لیکن غفار خان نے اپنے ساتھیوں سے کہا "ان پر یقین مت کرو۔ یہ لوگ کسی پر بھروسہ نہیں کرتے جو دوسروں پر بھروسہ نہ کرے وہ خود اعتماد کے لائق نہیں ہوتا" آخر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔

آندولن بڑھایا گیا۔ غفار خان نے اپنے گاؤں اتمان زئی کے باشندوں میں جذبہ پیدا کیا۔ اس بارے میں کئی قصے مشہور ہیں۔ ایک بار ایک واقعہ سناتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔۔۔

"انگریز ان دنوں فوج کے ساتھ گاؤں میں آیا کرتے تھے اسے گھیرے میں لیتے، گاؤں کے لوگوں کو دھوپ میں بٹھا دیتے ان سے کہتے انگوٹھا لگا دو اور کہدو کہ تم خدائی خدمتگار نہیں ہو، اکثر ان سے زبردستی انگوٹھا لگوا لیتے ۔ مزیدار بات یہ کہ اگر انگوٹھا لگواتے تو وہ جھٹک کر ہاتھ کھینچ لیتے اب انگریزوں کو علم ہو گیا کہ لوگوں میں اب ایک خطرناک شعور جاگ رہا ہے وہ اب مشہور ہو رہے تھے۔

ادھر کانگریس سے سمجھوتہ ہونے کے بعد ایک جانچ کمیٹی بن گئی ظلم ڈھانے والوں کی جانچ ہونے لگی۔ پٹھان ان کے ساتھ تھے اس لیے اب وہ اگر پختونوں پر ظلم کرتے

توانھیں جواب دیناپڑتا تھا۔ ان کی تباہ کن یوجنائیں (پلان) اب اور ہی رخ اختیار کرنے لگی تھیں۔

1926ء میں لارڈ اروِن ہندوستان کے وائسرائے بنا کر بھیجے گئے ان کے زمانے میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا۔ 1929ء میں لاہور میں کانگریس کا اجلاس ہوا اس میں مکمل آزادی کا اعلان کیا گیا اس سے جھگڑا دوبارہ کھڑا ہوگیا۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں تحریک عدم تعاون شروع ہوئی۔ نمک قانون توڑنے کی کوشش کی گئی۔ انگریز سرکار نے لیڈروں کی پھر پکڑ دھکڑ شروع کردی۔ انھیں جیلوں میں ٹھونس دیا گیا 1930ء میں سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی اس سے آگ اور بھڑک اٹھی۔ اسے سلجھانے کے لیے اسی سال لندن میں گول میز کانفرنس بلائی گئی لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ غفار خان اور گاندھی جی نے آپس میں مشورہ کیا۔ تیج بہادر سپرو اور جے کرنے بھی گاندھی جی سے ملاقات کی ان سب کا اچھا نتیجہ بر آمد ہوا۔ 1931ء میں ایک سمجھوتہ ہوا اسے گاندھی اروِن پیکٹ (Gandhi Irwin Pact) کہا جاتا ہے سیاسی شرط تھی کہ اگر گاندھی تحریک (آندولن) روک دے تو تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کردیا جائے گا، بغیر ٹیکس ادا کئے نمک بنانے کی اجازت ہوگی۔ اس کے بعد ہی لارڈ اروِن اپنے عہدے سے سبکدوش ہوگئے۔

اروِن کو ہندوستان سے جانا پڑا اس کے بعد لارڈ ولنگٹن وائسرائے بنا۔ امید یہ کی جارہی تھی کہ گاندھی اروِن معاہدے کے بعد حالات بہتر ہوں گے۔ غفار خان کو محسوس ہو رہا تھا کہ انگریز ظلم سے باز آجائیں گے پر ایسا ہوا نہیں پٹھانوں کو برابر پریشان کیا جارہا تھا۔ انگریز انھیں بڑی بے دردی سے پیٹتے تھے اس کے باوجود پٹھانوں نے ہمت نہیں ہاری ان کی خودداری اور غیرت کو ٹھیس پہنچانے میں کمی نہیں آئی۔

پٹھان مسلسل جلسے کرتے رہے انگریزوں نے انھیں دبانے کا دوسرا راستہ اپنایا وہ اب توپیں بھیجنے لگے۔ جہاں جلسے ہوتے انگریز توپیں بھیج دیا کرتے۔ توپوں کا منہ جنتا کی طرف کر دیتے۔ میٹنگوں میں گولیاں بھی چلائی جاتیں۔اس سے بھگدڑ مچ جاتی۔

ان دنوں غفار خان گجرات جیل میں تنہا تھے۔ان کے سبھی ساتھی چھوڑ دیے گئے تھے انھوں نے جیلر سے پوچھا" مجھے اب کس لیے قید میں رکھا گیا ہے؟"۔

جیلر نے کہا" یہاں نیتاؤں کی ایک جماعت آرہی ہے وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں"۔

غفار خان کی خودداری جاگ اٹھی وہ ایک دم بول اٹھے "دکھ کے دور میں تو انھوں نے ہمیں کوئی مدد نہیں کی اب ہمیں ان کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ملنا چاہتے ہیں تو بھی ہم ان سے نہیں ملیں گے"۔

غفار خان کی یہی خودداری ان کی کامیابی کا راز ہے انھوں نے بے کار کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے اور نہ سمجھوتے کیے۔ جس سے بھی دوستی کی خلوص سے کی ان کی زندگی میں ایثار اور قربانی کا جذبہ سمایا تھا کہ انھیں کچھ بھی تکلیف دہ نہ لگتا۔ جیل کی صعوبتیں ان کے سامنے ہیچ تھیں۔ بڑے سے بڑا انگریز افسر چھوٹا ہوتا گیا۔ غفار خان کی باتیں ان کی شرطیں اب مانی جانے لگیں تھیں۔ وہ جو بھی کہتے صرف جنتا کی بھلائی کے لیے اوروں کی مفاد کی باتیں ہی انھیں سوجھتی تھیں اسی لیے ان کا اثر بڑھتا جارہا تھا۔ان کا ہر جملہ ان کا بھاشن عوام پر اثرانداز ہو جایا کرتا تھا۔ ان کے اس بڑھتے ہوئے اثر کی ہی وجہ سے انگریزوں کو اپنے مظالم کم کرنے پڑے۔

غفار خان کے ساتھیوں نے کئی بار انگریزوں کا گھیراؤ کر لیا۔ ان کے سیاسی ایجنٹوں کو انھوں نے کئی بار فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ چاروں طرف لاقانونیت پھیلا کر غفار خان

نے یہ ثابت کر دیا کہ انگریزوں کو اب ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا۔ قبائلوں نے اب انگریزوں سے مسلح جنگ کرنیکی بھی ٹھان لی تھی۔ اور انھوں نے گاندھی اور غفار خان کو جیل سے رہا کرنے پر مجبور کر دیا۔

مالاکانڈ میں جب مہاتما گاندھی اور غفار خان کو آزاد کرنے کا فیصلہ کیا تو ان کے لیے اعلیٰ انتظام بھی کیا گیا۔

پارٹی کا انتظام تھا۔ چائے کی پیالیاں کھنک رہی تھیں نذرانہ دینے کے لیے نوٹوں کے انبار لگے ہوئے تھے لیکن خوددار پٹھانوں نے انھیں حقارت کی نظر سے دیکھا کسی نے چائے کی پیالی بھی منہ سے نہیں لگائی۔ ایک پولیٹکل ایجنٹ آگے آیا اس نے ایک خان سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ بول اٹھا۔

"تمہارے ہاتھ میرے بھائیوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں انھیں چھو کر میں اپنے ہاتھ ناپاک نہیں کرنا چاہتا۔ انہی ہاتھوں سے تم نے پٹھانوں کو ایذائیں پہنچائی ہیں۔ کوڑے لگائے ہیں، گولیاں داغی ہیں انھیں جیلوں میں بھوکا مارا ہے بتاؤ ایسے ظالم ہاتھوں سے ہم کیسے ہاتھ ملائیں"۔

انگریزوں نے ان کی آنکھوں میں نفرت دیکھی تھی ایک ایجنٹ نے بھی آگے آکر کہا "آپ لوگ اب ہم سے اپنائیت کا سلوک کریں تو آپ کی ہر ملکی مانگ پوری کریں گے "اس کا کسی نے جواب نہیں دیا انگریزوں کے خلاف نفرت کافی گہری ہو چکی تھی۔

گاندھی جی غفار خان کے بہت قریب تھے اور پیارے تھے۔ اسی وقت سے سرحدی گاندھی کہا جانے لگا وہ جنگ آزادی میں گاندھی جی کے دوش بدوش اہم کردار ادا کر رہے تھے۔

ادھر پٹھانوں میں پارٹی بندی ہو رہی تھی۔ آپسی دشمنی تھی چھوٹی چھوٹی بات پر

جھگڑا ہو جاتا۔ پھر مقدمے ہوتے۔ جو ترقی ہوتی وہ آپسی نفاق کی وجہ سے برائیوں کی بھینٹ چڑھ جاتی۔ غفار خان نے پٹھانوں کو منظم کیا۔ ان میں تشدد پسندی اتنی زیادہ تھی کہ وہ ذرا غصہ میں آتے تو مرنے مارنے پر اتر آتے۔ ہنسا کی اس آگ میں بھائی بھائی جھلنے لگتے پھر آپسی پھوٹ بڑھ رہی تھی۔ غفار خان نے سب کو پیار کے بندھن میں باندھنے کی کوشش کی اپنی ایک ملاقات میں انھوں نے کہا تھا۔

"میری خواہش ہے کہ لوگ خلیق اور مہذب ہوں بہادر ہوں، دیس پریمی ہوں ان میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہو، آن اور غیرت کے لیے مر مٹیں۔ وہ ظلم سے بچیں۔ ہنستے کھیلتے زندگی گذاریں۔ مہذب ہوں وہ ایسی راہ پر مضبوطی سے گامزن رہیں۔

یہی پیغام انھوں نے لوگوں کو دیا۔

غفار خان کی تقریریں لوگوں میں خوداعتمادی پیدا کردیتیں۔ ان کا حوصلہ بڑھاتیں۔ جب کبھی وہ تقریر کرتے لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی وہ گرج کر کہتے۔

"دیکھو تمہاری ہمت اور حوصلے نے انگریزوں کا ایک سینگ توڑ دیا ہے۔ وہ اب یہاں ٹکے رہنے کے لیے ہماری شرائط ماننے کے لیے مجبور ہیں۔ اٹھو اور ان کا دوسرا سینگ بھی توڑ ڈالو۔ یہ ملک تمھارا ہے۔ تمھارے بچوں کو آزاد دیس میں سانس لینے کا حق ہے۔ تمھاری آپسی پھوٹ اور خود غرضی کی وجہ سے انگریز تمہارے وطن کو ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی بھوک میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ ان کا اپنا دیس بھی ہے لیکن وہ یہاں کے لوگوں کو یتیم بنانا چاہتے ہیں۔ یہاں بچے بھوکے پیاسے رہیں۔ یہ تمہاری ہی محنت کی کمائی اور تمہارے ہی دیس کی فصل کو اپنے ملک میں لے جاتے ہیں یہ تمہارے وطن کو پورا ہڑپنا چاہتے ہیں۔ بڑھو ان کا دوسرا سینگ توڑنا ہوگا"۔

ان کی بلند آواز سے سارا ملک گونج اٹھا۔ ادھر انگریزوں کے غصے کا بھی ٹھکانا نہیں تھا۔ لوگ بھڑک رہے تھے۔ جہاں کہیں انگریزوں کو دیکھتے ان کے غصے کی آگ اور بھڑک اٹھتی۔ انھوں نے غفار خان کا ہر لیکچر سنا انھیں پتا چل گیا کہ وہ صلح کرنا نہیں چاہتے وہ سب کو بھڑکانا چاہتے ہیں۔ تعلقات بگاڑنا چاہتے ہیں ایسی آگ لگانا چاہتے ہیں جو کسی بھی وقت انگریزوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ اس لیے انھوں نے غفار خان کو اپنے ساتھیوں سے علاحدہ کرنے کا پلان بنایا۔ پٹھانوں سے بولے:۔

"تم لوگ تو پڑھے لکھے (عالم) ہو پھر کیوں غفار خان کے پیچھے لگے ہو خود آگے کیوں نہیں آتے۔ کام تم کرو نام اس کا ہو آؤ ہمارے ساتھ مل جاؤ۔ ہم سمجھوتہ کر سکتے ہیں"۔

انگریز اپنی چالوں سے باز نہیں آرہے تھے انھوں نے ہر طرح کے ہتھ کنڈے اپنائے۔ کہا غفار خان پکا مسلمان ہے۔ اسے پٹھان سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اسی دھوکے میں کئی لوگ آگئے۔ لیکن سچائی چھپی نہیں رہ سکتی۔ دادا بھائی نوروجی نے صاف کہا "غفار خان مذہب سے اوپر ہے"۔

مہاتما گاندھی نے کہا۔ "دھوکے میں مت آؤ اپنے آدمی کو پہچانو"۔

اس کا نتیجہ اچھا نکلا۔ پٹھان آہستہ آہستہ بھارت کے اور قریب آئے ان کے رسم و رواج بھارت سے مختلف نہیں تھے ان کی تہذیب بھی ملتی جلتی ہے۔

پٹھانوں کو عام طور سے ساہوکاروں (قرض دینے والے) کے طور پر جانا جاتا تھا۔ یہ لوگ ضرورتمندوں کو قرض روپیہ دیتے تھے لکھنا پڑھنا انھیں آتا نہیں تھا۔ وہ آدمی کو پہچان لیتے۔ اس کا گھر اور دفتر (کام کرنے کی جگہ) اچھی طرح دیکھ لیتے تھے۔ پھر پہلی تاریخ کو جب تنخواہ ملتی وہ آکھڑے ہوتے۔ اپنا سود نہیں چھوڑتے تھے۔ پٹھان جیسے پیسہ قرض دیتا

ویسے ہی وصول کرنا بھی جانتا تھا۔ وہ لوگ کم گو اور سادہ تو ضرور تھے لیکن اپنے پیشے کے پکے تھے۔ ان میں کچھ پٹھان ہینگ بیچنے کا کام بھی کرتے تھے۔

ایک عام پٹھان کو دیکھئے دراز قد پورا کسا بدن، لمبی ناک، متوسط آنکھیں، مضبوطی سے پیر رکھ کر چلنے کا انداز بے حد شیریں کلام، کوئی ان کی پکڑ میں ایک بار آجائے تو پھر دیکھئے۔ ان کی اپنی پوشاک ہے گھیر دار شلوار، لمبا کرتا، اوپر واسکٹ، سر پر کلغی دار صافہ اس لیے دور سے ہی انھیں پہچانا جا سکتا ہے۔ یہ دوستوں کے دوست ہوتے ہیں۔ دوست کے لیے خون بہا دیں گے، دشمن کا خون پی جائیں گے۔

یہ کیریکٹر کہاں سے ملا؟ جب ہندوستان تقسیم نہیں ہوا تھا تب ان کا حدود اربعہ دیکھئے۔ شمال مشرقی صوبہ ان کا گھر تھا اس کا رقبہ از تیس ہزار مربع میل یعنی چیکوسلوواکیہ سے بھی بڑا شمال میں کوہ ہندوکش، جنوب میں بلوچستان اور پنجاب کا ڈیرا غازی خاں، مشرق میں کشمیر، مغرب میں افغانستان ۔ شمال مغرب صوبہ سرحد میں چھ اضلاع تھے، ہزارہ، پیشاور، کوہاٹ، بنّو، مردان ڈیرہ اسماعیل خاں اور قبائیلیوں سے بھرے علاقے۔ انتظامی لحاظ سے یہ صوبہ پانچ حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ مالا کنڈ، کرم، خیبر، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان۔

تاریخ گواہ ہے کہ اس ملک میں جتنے حملہ آور آئے وہ درّہ خیبر اور درہ بولان کے دروں سے آئے تھے سب سے مورچہ لیا تھا پٹھانوں کے اس پورے علاقے کی آب وہوا عجیب ہے۔ ڈیراجت میں گرمی ہے، ہزارہ ٹھنڈا ہے۔ میدان ہیں لیکن کم پورا علاقہ پہاڑی ہے کہیں کہیں چیڑ اور دیودار کے درخت ہیں۔ کہیں گنے کی کاشت ہوتی ہے۔ سیب انگور بادام اور بڑی کھجور پورے صوبہ میں ہوتے ہیں۔ یہاں ایک جھیل بھی ہے۔ وہاں نمک بنتا

ہے۔ اسے نمک کی جھیل کہتے ہیں۔ پہلے پتھر کی طرح سخت نمک آتا تھا۔ بعد میں سمندر کے پانی سے نمک بنایا جانے لگا اس صوبہ کے جنوب میں ریگستان ہے۔ کتنا ایک دوسرے سے مختلف ہے یہ علاقہ!

پٹھانوں کی تعداد اس علاقہ میں سب سے زیادہ تھی ان کی زبان پشتو یا پختو۔ وہاں ہندو بھی ہیں سکھ اور مسلمان بھی۔ مسلمان مالدار تھے۔ بینک چلاتے تھے۔ سونے کا کام کرتے تھے۔ کپڑے کے تاجر تھے ان کے علاوہ قبائلی (آدی واسی) بھی تھے۔ قبائلی گھنے جنگلوں میں رہتے۔

جہاں اتنا آپسی فرق ہو وہاں کے باشندے کیسے ہونگے دھرتی اور موسم انسان کو بناتے ہیں۔ میں ایک واقعہ بتانا چاہتا ہوں ایک انگریز بڑا افسر تھا۔ تب انگریز راج تھا۔ وہ ضلع کے لیے اپنے کچھ ہندوستانی اہلکاروں کے ساتھ وہاں گیا۔ برسات کے دن تھے اس نے دیکھا لوگ گھر کے چھپر کے اوپر چکنی مٹی ڈال رہے تھے پھر اسے ڈنڈے سے پیٹتے۔ پیٹ کر اسے پلاسٹر کی طرح ہموار کر لیتے۔ افسر نے بھارتی اہلکار سے پوچھا "یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟"۔

اس نے بتایا "جناب! یہ مٹی پیٹ کر چکنی کر رہے ہیں سوکھ کر یہ سخت ہو جائے گی برسات کے دنوں میں یہ محفوظ رہیں گے"۔ انگریز افسر نے اپنا گھوڑا روک لیا اس نے دوسرے افسروں کے طرف دیکھا۔ انھوں نے دریافت کیا "کیا ہوا سر؟"۔ "کچھ نہیں" وہ بولا۔ "جہاں کی مٹی پیٹے جانے سے ہی محفوظ رہتی ہے وہاں کا آدمی بھی ویسا ہی ہوگا۔ ہم سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ ہم اپنی فوجیں بھیجیں گے"

ہندوستانی افسر نے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن کوئی اثر نہیں ہوا۔ تاریخ شاہد ہے کہ انگریزوں نے وہاں فوجیں بھیجیں پر انگریز ایک چیز بھول گئے وہ تھی مٹی کے پیٹے

جانے کی بات۔ فوجیں بھی اسی طرح پٹی گئیں قتل عام ہوا یہ بات الگ ہے کہ بڑی طاقت کے سامنے آدمی کمزور ہوتا ہی ہے۔

اس پوری تمہید کی روشنی میں اصل پٹھانوں کو دیکھنا چاہیے غفار خان بھی پٹھان تھے۔ وہ تب بھی پٹنے والے پٹھان نہیں تھے۔ وہ اڑیل اور دم دار پٹھان تھے۔ انھوں نے انگریزوں کوناکوں چنے چبوادیے۔ تب سے لے کر آخری دم تک، غفار لڑتے ہی رہے۔

ملک آزاد ہوا۔ پٹھانوں کے لیے اس آزادی کے کوئی معنی نہیں تھے۔ وہ جنگلی ریچھوں کی بھیڑ میں جینے کے لیے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ غفار خاں تقسیم کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیکن ہوا وہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کے بعد بھی انھیں پندرہ سال جیلوں میں گذارنے پڑے۔ گاندھی جی نے اسی لئے کہا تھا:

"غفار خان کوہستانی (پہاڑی) آدمی ہے۔ اس میں خود اعتمادی ہے۔ اس کے اپنے اصول ہیں۔ وہ اصولوں کی خاطر اپنی جان دے دے گا۔ وہ آخری سانس تک لڑتا رہے گا۔ غفار خان ٹوٹ سکتا ہے جھک نہیں سکتا"۔

خان صاحب کو اپنے لئے چاہیے بھی کیا تھا۔ انھیں اقتدار کی بھوک نہیں تھی۔ وہ عیش و عشرت کی زندگی کی تمنا نہیں رکھتے تھے انھوں نے اپنے لئے کچھ نہیں کیا۔ وہ چاہتے تھے پٹھانوں کو عزت ملے۔ پختون فخر سے سر اٹھا کر جی سکیں ان کی ساری جد و جہد پختونستان کے لیے تھی۔ ایسی جگہ جہاں یہ بہادر قوم بھرپور خود اعتمادی اور آزادی کے ساتھ جی سکے۔

جنگ دو طرح سے لڑی جاتی ہے تشدد کے ساتھ عدم تشدد کے ساتھ غفار خان پر گاندھی جی کا بھرپور اثر تھا اس لیے لڑائی بھی عدم تشدد کی ہوگی۔ انھوں نے تمام مذہبوں

کو ایک سمجھا۔ اتنا بڑا پیغام لے کر تمام عمر ایک سادی زندگی گذارتے رہے انسانیت کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا؛ یہی ان کا کہنا تھا۔ انسانیت کا مطلب ہے صحیح طور سے زندگی گزارنا، سب کو برابر موقع ملیں۔ ان کا موازنہ (مقابلہ) کبیر داس سے کیا جاسکتا ہے۔ کبیر نے چاروں طرف بیداری پیدا کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا "جو گھر پھونکے اپنا چلے ہمارے ساتھ"۔

غفار خان نے بالکل کبیر جیسا ہی کام کیا۔ سارے عیش و آرام تیاگ دیے شاید کبھی اپنائے بھی نہیں تھے۔

1939ء میں گاندھی جی نے غفار خان کو باردولی بلایا۔ باردولی اسٹیشن پر جب وہ اترے تو ان کے پاس ایک سادہ سا جھولا تھا۔ اس میں ایک کپڑوں کا جوڑا اور کچھ کاغذات تھے۔ غفار خان نے کہا تھا "مجھے کچھ نہیں چاہئے میں تو گاندھی جی کے بس میں ہوں جب تک چاہیں گے ان کے ساتھ رہوں گا"۔

یہ سادگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ 1934ء میں غفار خان گاندھی جی سے ملنے سیواگرام آئے تھے۔ اسی دوران ان کے اور گاندھی جی کے تعلقات بہت نزدیکی ہو چکے تھے۔ وہ گاندھی خاندان کے ایک فرد بن گئے تھے۔

شام کا وقت تھا۔ سیواگرام میں باپو اور غفار خان اکیلے باتوں میں مصروف تھے۔ باپو نے کہا "غفار خان! تم اس بار کانگریس کے صدر بن جاؤ"۔ "نہیں" غفار نے اپنا سر جھکا دیا۔ کہا "باپو! میں عمر بھر ایک سپاہی رہا ہوں۔ سپاہی ہی کی طرح مرنا چاہوں گا۔ میں اس آشرم میں ایک عام آدمی کی طری رہنا چاہتا ہوں"۔

گاندھی جی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ غفار خان آشرم میں ایک عام آدمی کی طرح ہی رہے۔ انھوں نے کچن (باورچی خانہ) میں بھی کام کیا۔

باپو اور وہ شام ساتھ ہی گذارتے تھے۔ خان صاحب باپو کو قرآن پڑھکر سناتے تھے اور گاندھی جی بڑے غور اور توجہ سے سنا کرتے تھے۔ جہاں پوچھنا ہوتا پوچھتے بھی تھے۔ یہ معمول تین سال تک جاری رہا۔ 1937ء تک خان صاحب گاندھی جی کے ساتھ ہی رہے۔ ان دنوں مہمانداری کی ذمہ داری جمنالال بجاج پر تھی باپو نے ایک دن بجاج جی سے کہا "یہاں پورا ایشیا سانس لے رہا ہے اس کے باہر اور کیا ہوگا؟"

گاندھی جی نے خان صاحب کو اپنا پورا پیار دیا تھا اس لیے لال بہادر شاستری نے ان کا سمان کرنا چاہا تھا۔ شاستری جی تاشقند گئے تھے انہوں نے کہا تھا "میں لوٹتے ہوئے غفار خان سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

بد قسمتی سے شاستری جی کا تاشقند میں انتقال ہو گیا۔ غفار خان ان کا انتظار کرتے ہی رہ گئے۔ قسمت کی کتنی بڑی ستم ظریفی تھی۔ شاستری جی نہیں رہے لیکن غفار خان ان کو یاد کیا کرتے تھے۔ خان صاحب نے ایک دفعہ رندھے ہوئے گلے سے کہا تھا "ہندوستان کا ہر شخص میرا بھائی ہے۔ وہ جسم سے دبلا پتلا تھا لیکن بہت بڑا آدمی تھا کاش شاستری میری جھونپڑی میں آتا اور دیکھتا کہ ایک آدمی ایسا بھی ہے جو پورا آدم قد ہے وہ اب بھی بھیڑیوں کے بیچ میں ہے خان صاحب نے بہت افسوس کے ساتھ کہا تھا۔ "دیکھو! ہمارا وطن تو ہندوستان ہے، ہم کہاں چلے گئے"۔

یہ کہانی ایک پٹھان کی ہے ایک پٹھان زندگی کی۔ اسے کسی کا خوف نہیں تھا۔ حکومت پاکستان انھیں گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ پکڑتی تو کیا کرتی وہ تو گھنے جنگل میں آزاد شیر کی طرح زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن وہ شیر چین سے نہیں تھا۔ بے چین اور مضطرب تھا۔ کہتا تھا "میرے بھائی پٹھانوں کو ان کا حق مل جائے تو۔۔۔"

اسی "تو۔۔۔ میں تو سارے سوال پوشیدہ تھے۔ بنجر خطے کے یہ لوگ جدوجہد نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا؟"۔

شمالی مشرقی صوبہ کی طویل تاریخ ہے۔ شہنشاہ اشوک کی یہاں حکومت تھی۔ پیشاور راجدھانی تھی۔ ہندوکش سے آریہ یہاں آئے تھے۔ بعد میں سارے دیس میں پہنچے۔ پیشاور کا ایک ضلع گندھارا ہے۔ مہابھارت کی ایک کردار گندھاری یہیں کی رہنے والی تھی۔ کورو گندھاری کے بیٹے تھے۔ کورو نے ہستناپور کو اپنا دارالخلافہ بنایا تھا۔ آج کی دلّی سے ہستناپور تقریباً100 کلو میٹر دور ہے۔ پیشاور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پرشورام نے اسے بسایا تھا۔ پرشورام براہمن تھے وہ رامائن کے ایک مشہور کردار ہیں۔ تاریخ آگے بڑھتی ہے۔ چندر گپت موریہ کے زمانے میں یہ بدھ مذہب کا مرکز تھا۔ پھر یونان سے سکندر آیا۔ بعد میں محمود غزنوی نے حملہ کیا پھر تغلق آئے بعد میں مغل 1820ء کے آس پاس مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پیشاور پر قبضہ کرلیا۔ ان کی موت کے بعد انگریز برسر اقتدار آئے آگے کی تاریخ سے بہت سے لوگ بخوبی واقف ہیں۔ ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان وجود میں آیا۔ پاکستان کا مسئلہ تب بھی حل نہیں ہوا۔ بادشاہ خان نے موہ بند اور باجوڑ علاقوں کے قبائل کو بھڑکایا۔ پورے علاقے میں بے چینی پھیل گئی۔ 6/اپریل 1919ء کو اتمان زئی میں ایک جلسہ ہوا۔

پہلی بار غفار خان نے ایک بڑے جلسے میں حصہ لیا تھا۔ انہی دنوں وہاں بہرام خان بھی تھا۔ ستر سال کا وہ بوڑھا انگریزوں کا دوست تھا۔ اس نے غفار خان کو دھمکی دی کہ انگریز اسے گولی سے اڑا دیں گے۔ عوام نے انھیں بادشاہ خان کہنا شروع کر یا تھا ایک بار انگریزوں نے پوچھا "کیا تم بادشاہ ہو؟ "غفار خان نے کہا "میں نہیں جنتا۔ میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ میں جنتا کا خادم ہوں"۔ پہلی بار ہتھکڑی پہنا کر غفار خان کو جیل پہنچادیا گیا۔ اسی دوران ان

کے والد بادشاہ خان بھی جیل گئے۔ انھیں چھ ماہ کے اندر ہی رہا کر دیا گیا وہ 1920 میں ناگپور کے کانگریس اجلاس میں شامل ہوئے۔

غفار خان تب تک اپنے والد کے کام میں پوری طرح ہاتھ بٹانے لگے تھے بادشاہ خان کو بہت ایذائیں پہنچائی گئیں۔ وہ کئی بار جیل گئے۔ وہاں بھی انھوں نے کہا کہ گیتا اور قرآن پڑھنے کا سب کو حق ہے۔ وہ خود روز نماز پڑھتے تھے روزے بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے مہادیو ڈیسائی سے کہا تھا ”اسلام کے معنی جانتے ہو اسلام کا مطلب ہے عمل، یقین اور محبت عمل یعنی کام، یقین یعنی بھروسہ اور محبت یعنی پیار۔

غفار خان نے اپنے والد سے یہ سب خوبیاں ورثہ میں پائیں اسی لیے گاندھی جی نے انھیں خدائی خدمتگار، کہا اس کا مطلب ہے خدا کا بندہ یا خدا کا خدمتگار۔ یہ بات 1939ء کی ہے۔ کراچی میں کانگریس کا اجلاس تھا۔

خدائی خدمتگار تحریک کانگریس کا یک حصہ بن گئی۔ کام کرنے والے کم تھے 1938ء میں کہیں جاکر اس تنظیم میں 10 ہزار ورکر شامل ہو پائے۔

خدمت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ باپ بادشاہ خان ان کے بڑے بیٹے خان صاحب اور چھوٹے بیٹے خان عبد الغفار خان سبھی خدمت میں مصروف تھے۔ غفار خان کو کئی بار جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ تب بھی انگریزوں کے خلاف ان کے دل میں کوئی نفرت نہیں تھی۔ وہ کہتے تھے ہماری تحریک سماجی ہے، ساتھ ہی سیاسی بھی ان کے پیروکار لال کرتہ پہنتے تھے ان کا کہنا تھا ”لال کرتہ پہننے کا مطلب یہ ہے کہ پڑوسیوں سے پیار کرو ہمیشہ سچ بولو“۔ پٹھان لڑاکا قوم ہے۔ جنم سے ہی وہ متشدد ہوتے ہیں میں انھیں امن پسندی (اہنسا) کا سبق پڑھاتا ہوں“۔

غفار خان برسوں اپنی قوم کی خدمت کرتے رہے۔ ان کا پورا خاندان ان کے

ساتھ تھا۔ 1934ء میں جیل سے چھوٹ کر گاندھی جی کے پاس گئے۔ گاندھی جی کا آشرم وار دھا میں تھا۔ غفار خاں نے لندن میں اپنی بیٹی کو ایک خط لکھا تھا وہ پڑھنے کے لیے لندن گئی ہوئی تھی۔ خط ملتے ہی وہ گاندھی جی کے آشرم میں آئی غفار خان نے وار دھا کے مہیلا آشرم میں اسے بھرتی کر دیا ان دنوں میرا بین آشرم دیکھتی تھیں ان کا اصل نام کماری سلادے، تھا وہ ایڈ مرل سلادے کی بیٹی تھیں۔ میرا بین نے اپنی ساری زندگی گاندھی جی کو نذر کر دی تھی۔

غفار خان زیادہ عرصہ تک وار دھا میں نہیں رہ سکے۔ انھیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ 1936ء میں وہ جیل سے باہر آئے۔ چھوٹتے ہی دوبارہ وار دھا لوٹ آئے۔

وار دھا میں غفار خان اور گاندھی جی اکثر روز ملا کرتے تھے۔ غفار خاں مسلمانوں کے نمائندے مانے جاتے تھے۔ گاندھی جی باقی جنتا کے۔ آہستہ آہستہ دونوں کافی قریب آئے۔ سارے مذہب خدا کے قریب پہنچنے کے لیے ہیں ان میں تفریق کہاں۔ اس کے علاوہ وہ زمانہ جنگ آزادی کا تھا۔ انگریز سرکار سخت سے سخت ہوتی جا رہی تھی۔ انگریزوں نے شمالی، مغربی صوبہ سرحد میں چناؤ کا اعلان کیا۔ غفار خان وہاں جانا چاہتے تھے ان کے بھائی جانے کے لیے بیتاب تھے۔ انگریز حکومت نے ان کے وہاں جانے پر پابندی لگا دی یہاں تک کہ مہاتما گاندھی کو بھی وہاں نہیں جانے دیا گیا۔ جواہر لال نہرو پر بھی پابندی تھی۔ چناؤ بھی عجیب تھا۔ مسلم لیگ کے علاوہ اور کوئی جماعت حصہ نہیں لے سکتی تھی۔

ان سب کے باوجود ہوا کچھ اور غفار خان کے بھائی ڈاکٹر خان الیکشن جیت گئے اگرچہ وہ وہاں گئے بھی نہیں تھے۔ ان کی غیر حاضری میں ہی عوام نے انھیں ووٹ دیے۔ کانگریس کی سرکار بن گئی۔ ڈاکٹر خان شمال مغربی صوبے کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ غفار خان

نے کوئی چناؤ نہیں لڑا۔ انھوں نے اپنے بھائی کی وزارت میں بھی شامل ہونا مناسب نہیں سمجھا ان کا کہنا تھا "میں فقیر ہوں فقیر کی طرح رہوں گا اور عوام کی خدمت کروں گا"۔ اب غفار خان کو اپنے علاقہ میں کام کرنے کا پورا موقع مل گیا۔

دوسری جنگِ عظیم

شمالی، مغربی صوبہ سرحد پر امن نہیں تھا۔ انگریز نہیں چاہتے تھے کہ وہاں کانگریس سرکار بنے اس لئے کئی مشکلات کھڑی ہو گئیں۔

1938ء میں ستمبر کا مہینہ تھا۔ یوروپ میں دوسری جنگ عظیم کی تیاری شروع ہو گئی تھی۔ ہٹلر کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ گاندھی جی صوبہ سرحد گئے وہاں چاروں طرف فسادات ہو رہے تھے۔ منشیرہ، ڈیرہ اسماعیل خاں ہزارہ سبھی جگہ خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ گاندھی جی وہاں پہنچے تو رمضان کا مہینہ چل رہا تھا۔ گاندھی جی نے دورہ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ غفار خان نہیں مانے۔ رمضان میں بھی وہ گاندھی کے ساتھ دورہ کرتے رہے۔ اتمان زئی سب سے زیادہ فساد زدہ تھا۔ گاندھی جی وہاں بھی گئے۔ ایک مکان میں انھیں ٹھہرایا گیا۔ ان کی حفاظت کی ساری ذمہ داری غفار خان نے اپنے سر لی۔ گھر کے چاروں طرف اور چھت پر بندوق دھاریوں کا پہرہ لگا دیا گیا۔ غفار خاں نے کہہ دیا تھا "ہتھیاروں کا استعمال نہ کیا جائے۔ استعمال صرف تب ہی کریں جب حملہ کیا جائے"۔

بادشاہ خان پریشان تھے۔ وہ گاندھی جی سے ملنے گئے۔ انھوں نے کہا کہ وہ سیاست سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں۔ انگریز جنتا کو بھڑکا رہے ہیں۔ گاندھی جی نے ان کا حوصلہ بندھایا۔ انھوں نے غفار خان کی تعریف کی اور کہا "پہلے ہم انگریزوں سے خائف تھے اب ان سے لڑتے ہیں۔ ایمانداری سب سے بڑی چیز ہے لڑاکا (متشدد) پٹھان سے امن پسند (اہنسا وادی) پٹھان زیادہ بہتر ہے۔ غفار خان ان کو تشدد کے راستے سے ہٹا رہے ہیں"۔

گاندھی جی چلے گئے۔ غفار خان نے نم آنکھوں سے انھیں رخصت کیا گاندھی جی

نے خدائی خدمتگاروں کو ٹریننگ دینے کے لیے کئی آدمی بھیجے۔ میرابین کو بھی بھیجا۔ بادشاہ خان نے صبر و ضبط سے کام لیا۔ غفار خان نے پوری پوری مدد دی۔ میرابین نے سماجی سدھار کے لیے مسلمان عورتوں کو نیا راستہ دکھایا۔

غفار خان چاہتے تھے کہ گاندھی جی بار بار آتے رہیں۔ گاندھی جی کی صحت روز بروز گرتی جارہی تھی اس لیے وہ نہیں آسکے۔ بعد میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی ہٹلر نے دنیا بھر میں سنسنی پھیلادی۔

انگریزوں کی خواہش تھی کہ جنگ میں ہندوستان کے لوگ ان کا ساتھ دیں۔ ستمبر 1940ء کی بات ہے گاندھی جی نے سول نافرمانی تحریک شروع کی یعنی "ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے"۔ اس اندولن میں خان صاحب اور خان عبدالغفار خان نے پورا پورا ساتھ دیا۔

کچھ عرصہ بعد 'کرپس مشن' ہندوستان آیا۔ اگست 42ء کی بات ہے۔ یہیں سے "بھارت چھوڑو" اندولن شروع ہوا لوگ جیلوں میں بھرے جانے لگے۔

غفار خاں جیل جانے سے بچ گئے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے بھائی صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ تھے۔ پہلے انھیں وزیراعظم کہا جاتا تھا۔ بعد میں وزیراعلیٰ کہا جانے لگا۔

1946ء میں ملک میں چناؤ ہوئے یہ انتخاب مرکزی قانون ساز کونسل جسے اب سنسد یا پارلیمنٹ کہتے ہیں کے لیے اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے تھے۔ بادشاہ خان چناؤ میدان میں کود پڑے انھوں نے کہا "ہماری آزادی بہت قریب ہے۔ مجھے اقتدار نہیں چاہیے لیکن آزادی کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں سب کو جگانا چاہتا ہوں"۔

غفار خان چناؤ پرچار (کنویسنگ) میں ایک سپاہی کی طرح جٹ گئے آخر میں ان کے بھائی کی جیت ہوئی۔ جیت تو ہوگئی لیکن محمد علی جناح نے 1940ء میں ہی دو ملکوں کی بات

شروع کردی تھی ۔ پاکستان کی مانگ جناح نے کی تھی ۔اس میں کشمیر ، افغانستان ،بلوچستان، پنجاب، بنگال، آسام،اور سندھ کے صوبوں کو مانگا گیا تھا۔ یہ مانگ جناح اور مسلم لیگ نے کی تھی۔ غفار خان اور ان کے بھائی خان صاحب نے جناح کا ساتھ نہیں دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ خان صاحب کے کاموں میں رکاوٹ ڈالنے لگی۔

خان صاحب رکاوٹوں اور مشکلات کے بیچ کام کرتے رہے ان کی سب سے بڑی طاقت غفار خان ایک فقیر تھا۔ انھیں کوئی مدد نہیں چاہیے تھی۔ اس لیے نڈر ہو کر عوام کو راستہ دکھاتے رہے۔ مہاتما گاندھی کا ساتھ بھی انھوں نے کبھی نہیں چھوڑا۔ جنوری 1947ء میں غفار خان گاندھی جی کے ساتھ نواکھالی گئے۔ بہار میں ہندو مسلم فسادات روکنے میں غفار خان نے بڑی مدد کی۔ وہ سکھوں کے گرودواروں میں بھی گئے۔ منگیر کے ایک جلسہ میں غفار خان نے شیر کی طرح گرجتے ہوئے کہا تھا۔

"ہندو اور مسلمان الگ الگ نہیں ہیں۔ کہیں ہندو کم ہیں تو کہیں مسلمان۔ ایک مقام پر جھگڑا ہوگا تو دوسرے مقام پر بھی ہوگا خون ایک طرف ہی نہیں بہے گا"۔

غفار خان نے کانگریس کے وزیروں کو بھی نہیں چھوڑا۔ صوبوں میں فساد ہو رہے تھے۔ غفار خان نے وزراء سے کہا کہ وہ خادموں کی طرح آگے آئیں کہ خون خرابہ روکیں۔

غفار خان پیشاور لوٹے۔ وہاں حالت اور بھی زیادہ خراب تھی۔ انھوں نے خدائی خدمتگاروں کو رضاکاروں کی طرح کام میں لگایا۔ وہ بھائی چارہ کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے جگہ جگہ جا کر کہا

"تم سب خدا کے بندے ہو۔ اہنسا سے بڑا کوئی مذہب نہیں ہے ۔ سچائی اور ایمانداری سے ہی اچھا سماج (معاشرہ) بن سکتا ہے۔

اسی دوران ملک کے بٹوارے (تقسیم) کا کام شروع ہوا جس کی بنیاد فرقہ اور مذہب

تھی۔ شمالی مغربی صوبہ سرحد کو بھی تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصے میں پنجاب، بلوچستان اور سندھ آئے آسام اور بنگال دوسرے حصے میں گئے باقی تیسرا بھارت بنایا جانا تھا خان صاحب نے کہا "ہمیں منظور ہے لیکن اس میں مذہب کی خصوصیت نہیں ہونی چاہیے۔ انگریزوں نے یہ سب نہیں ہونے دیا۔ وہ چاہتے تھے دنگے فساد ہوں ڈاکٹر خان وزیر اعلیٰ نہ رہیں۔ ان کا (پٹھانوں کا) کوئی صوبہ نہ رہے۔

مارچ 47ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے بن کر آئے ان کے آتے ہی ہند کی تقسیم کا کام شروع ہوا۔ شمال مغربی صوبہ کی تقسیم کا بیڑہ غفار خان نے اٹھایا۔ جناح اپنی لڑائی الگ لڑ رہے تھے۔ مسلم لیگ پورا حصہ چاہتی تھی اس کھینچا تانی میں پورے ہندوستان کی تقسیم کھٹائی میں پڑی تھی آخر کہیں تو سمجھوتہ ہونا ہی تھا۔

یہیں سے خان عبد الغفار خان کا دوسرا قدم شروع ہوا اپنی جنتا کے لیے لڑنا۔ اسلامی فریب کا پردہ فاش کرنا ان کا دھرم بن گیا۔ وہیں سے ایک بڑی لڑائی کی ابتداء ہوتی ہے۔ تقسیم کے نتیجے میں ہندو پاکستان کے بیچ قتل عام ہوا تھا اس کے بعد پختونستان کی مانگ نے زور پکڑا۔ غفار خان میں وہی جوش آخر دم تک قائم رہا۔ شروع میں انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا۔

"بھائیو! خدا کا شکر ہے کہ انگریزوں سے ہمیں آزادی مل گئی۔ احمد شاہ ابدالی نے پختونوں کے لیے ایک سرحد بنائی تھی۔ وہ دریائے جہلم تک تھی۔ پاکستان نے ہمیں دھوکہ دیا۔ ایک انگریز کو بلوایا گیا۔ اس سے کتاب لکھوائی گئی "پٹھان" اس انگریز کا نام "اولف کیرو" تھا اس نے ہماری سرحد (سیما) مارگلی تک تصور کی یہ حد بھی ہم تسلیم کر سکتے ہیں۔ تب بھی آموندی تک پٹھانوں کی سیما (حد) بنتی ہے۔ یہ پختون ہیں۔ میرے سامنے امریکہ کی

مثال ہے۔ وہاں رہنے والے بھی امریکی نہیں ہیں تب بھی وہ خود کو امریکن کہتے ہیں۔ اس طری مارگلی سے 'آمو' ندی تک کا پورا علاقہ پشتونوں کا دیس ہے۔ یہاں کئی لوگ زبان کا جھگڑا پید کرتے ہیں کہتے ہیں فارسی، ہزارہ، پشتون اور تاجک الگ الگ زبانیں ہیں۔ یہ سب مفاد پرست ہیں۔ یہ ہمارے دشمن ہیں۔

انگریزوں نے ہمیں کاٹ دیا ہے۔ انھوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں ہم اپنے قبائلی بھائیوں کے پاس پھٹک بھی نہیں سکتے۔

انگریز چلا گیا۔ پاکستان ہم پر لاد دیا گیا۔ اب اسلامی حکومت آگئی ہے۔ یہ بھی اس طرح ہے جیسے انگریزوں کی تھی۔ پاکستان میں جتنے لوگ برسر اقتدار ہیں وہ سب انگریزوں کے کٹھ پتلی رہے ہیں۔ انگریزوں کو بھگانے میں ہم نے بھی ساتھ دیا تھا۔ اب ہمارے ساتھ کیسا برتاؤ ہو رہا ہے۔ پشتونوں میں تفرقہ پیدا کیا جا رہا ہے۔ افریقہ کے حبشی اپنے اندولن میں کھرے اترے وہ آزاد ہو گئے۔ بھارت پاکستان تو بن گئے لیکن ہماری لڑائی اب بھی جاری ہے۔ کتنے سال گزر گئے۔ ہمیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ ہم ناکام کیوں ہو رہے ہیں؟

آپ اپنے آباء واجداد کی تاریخ دیکھیں۔ انھوں نے ہمیشہ جھنڈے گاڑے ہیں۔ شیر شاہ کون تھا ہمارا پٹھان بھائی۔ میر وس کون تھا۔ آپ ہی کا بھائی بندھ پشتو تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پشتونوں کا جھنڈا اصفہان پر لہرایا۔ احمد شاہ ابدالی پشتون تھا یہ پٹھانوں کا دیس ہے جس پر پاکستان نے قبضہ جمایا ہوا ہے۔

ان کی تقریریں بڑی تیکھی ہوتی تھیں۔ ان میں جوش اور ولولہ تھا۔ تقریر کے دوران ایک شخص اٹھا اور جوش میں کہنے لگا

"اے پشتونو! دیس اس قوم کی ماں ہوتا ہے جو اس میں ہیں۔ آپ کا دیس آپ کی ماں

ہے جب آپ کے دیس میں ایک شخص پاکستان آ گیا یعنی اس نے ماں کے آنچل پر پیر رکھا ہے اب یہ آپ کی مرضی کہ آپ اس پیر کو اکھاڑتے ہیں یا نہیں۔ ماں کی عزت آپ کے حوالے"۔

غفار خان نے اپنے ایک لیکچر (31/اگست 1966ء) میں افغانستان حکومت کی تعریف کی۔

"میں افغانستان کے شاہ، وزیر اعظم اور حکومت کا ممنون ہوں جنھوں نے ہم بد نصیب، غیر منظم پشتونوں کو جمع کیا۔ آپ نے رہٹ دیکھا ہو گا۔ رہٹ گھومتا ہے۔ لوٹوں کی مالا کنویں میں جاتی ہے، وہ اوپر آتی ہے، باہر پانی چھوڑتی ہے۔ رہٹ پانی لینے نیچے چلا جاتا ہے۔ ہمارا حال بھی یہی ہے۔ یعنی قوموں کا بھی ہے۔ کہیں قومیں ابھر رہی ہوں گی، کہیں خالی ہو رہی ہوں گی۔

ہمارا دیس جگمگاتا تھا۔ دوسرے کچھ دیس خالی ہو رہے تھے۔ ہمارے ملک میں سکندر آیا تھا۔ اس نے تباہی مچادی تھی۔ چنگیز خاں نے بھی کمی نہیں چھوڑی، پھر عرب آئے مغلوں نے دخل اندازی کی پھر فرنگی یعنی انگریز آیا۔ وہ بے شمار چالاک، ذہین اور مکار نکلا۔ یہ فرنگی ہی وہ قاضی ہے جس کی طرف سے مجھے ہندو کہا گیا ابھی تک کوئی بھی مسلمان نہیں بنا سکا۔ مذہب کے ہاتھوں ہم کتنے ذلیل ہوئے ہیں۔ مذہب انسانیت سکھانے کے لیے بنایا گیا۔ دھرم کا اصول ہے انسان کو سچائی، انصاف اور جانکاری دینا"۔

"میرے دل میں ملک اور قوم کے لیے محبت ہے۔ میں ایک واقعہ سناتا ہوں ایک دن ہم جلال آباد میں بیٹھے تھے۔ وہاں ایک عورت آئی۔ ملک اور قوم کی باتیں شروع ہو گئیں۔ وہ عورت بولی "مجھے خدا، ملک اور قوم پر سے قربان کر دو" وہاں جنت کے کچھ ٹھیکیدار بھی موجود تھے۔ بولے "یہ عورت کافر ہے" مجھے بڑی حیرت ہوئی اسے کافر کیسے کہا

گیا۔ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ اس ملک میں جنت کے ایسے ٹھیکیدار بھی ہیں۔

اب پاکستان کو دیکھئے۔ یہاں اسلام اسلام کی رٹ لگائی جارہی ہے لیکن اس کے عمل کو دیکھئے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں پختونوں نے کیا گناہ کیا تھا؟ کیا قصور تھا ان کا؟ بلوچی بھائیوں پر بموں کی بارش کیوں کی جارہی ہے؟۔ اے میرے بھائیو! کیا ہم مسلمان نہیں ہیں۔ اسلام کیا کہتا ہے۔ قسم قسم کی باتیں کرتے ہیں کہتے ہیں "اے باچا خان" پاکستان بھی تو مسلمان ہے"۔

میرا جواب ہے۔ کس نے کہا پاکستان مسلمان نہیں ہے لیکن اسلام کیا کہتا ہے، کیا اسلام کہتا ہے کہ اپنا حق نہ مانگو؟ ہم اپنا حق ہی تو مانگتے ہیں اپنے حقوق کے طلب گار ہیں۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اسلامی اخوت (بھائی چارہ) ہو۔ ہمیں بھائی بنالو، غلام مت بناؤ، ہم غلامی برداشت نہیں کر سکتے"۔

غفار خان کی تقریر طویل تھی آخیر میں انھوں نے کہا:۔

"میں وہ انسان ہوں کہ میری قوم دریا میں ڈوب رہی ہے۔ ہندو کو چھوڑیے کافر بھی ہاتھ بڑھادے تو میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ میں پاکستانی مسلمانوں اور پختونوں سے کہتا ہوں "بھائیو! سب ایک ہو جاؤ اب مل کر مسائلُ کو حل کرلو"۔ اس تقریر کے بعد سارا مجمع کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک آواز میں آواز دی تھی "ٹھیک ہے باچا خان ،پاکستان نے اگر ہمارا حق نہ دیا تو۔۔۔،" غفار خان نے کہا "جو آپ کی مرضی ہو کیجئے"۔

اپنے تیسرے لیکچر میں غفار خان نے اور بھی باتیں اٹھائیں۔ یہ تقریر 31/اگست 1967ء میں کی گئی تھی۔ اس میں انھوں نے افغانستان کی بات کہی ہے۔

"میں افغانستان میں آیا۔ ایک شخص سے میں نے پوچھا "تم کون ہو؟" جواب ملا "میں ترکمان ہوں"۔

دوسرے نے کہا "میں پختون ہوں، فارسی داں ہوں"۔

یہ سب پھوٹ (علاحدگی پسندی) کی باتیں ہیں۔ ان سے بربادی ہوتی ہے قوموں کا نام نہیں ہونا چاہئے۔ کوئی انگریز بھی نہیں کہے گا کہ میں انگریز ہوں اس طرح دنیا کی قومیں ترقی کرتی ہیں ہم زمین پر آگئے ہم گڑھے میں گرتے جارہے ہیں۔ خدا نے ہمیں ایک حسین اور قوی ملک دیا ہے۔ وہ دولت سے مالامال ہے پھر ہم دنیا کی دوسری اقوام سے دور کیوں ہیں؟

غفار خان نے اپنے اس لیکچر میں پہلی بار واضح کیا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا:

"ہم دونوں بھائی بھائی ہیں۔ دونوں مسلمان ہیں۔ پاکستان پختونوں نے ہی دلوایا ہے اگر پختونوں نے شانہ سے شانہ ملا کر جنگ نہ کی ہوتی تو آزادی نہ ملتی ۔ پختونوں نے خون بہایا ہے ہم پاکستان کے پانچ بھائی ہیں۔ پنجابی، پختون، بنگالی، سندھی اور بلوچ۔ ہم الگ الگ نام نہیں چاہتے۔ ہم جنگ بھی نہیں چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں اپنا بھائی مانیں۔ جو لوگ بلوچستان میں رہتے ہیں ان کی خراب حالت دیکھئے۔ وہ صرف حق چاہتے ہیں ان کو مناسب حقوق دے دیں۔ نہیں دو گے تو وہ مجبور ہو جائیں گے۔ ہتھیار اٹھالیں گے۔ پاکستان نے ان پر مظالم کئے ہیں ظلم سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ پاکستان کے لوگ لوٹ کھسوٹ چاہتے ہیں۔ پختونوں کے پاس بہت دولت ہے تو ان کی دولت لوٹ لو۔ پختون بھولے بھالے ہیں۔ کسی نے کہہ دیا کہ یہ اسلامی ملک ہے وہ مان گئے۔ جانتے بھی نہیں کہ اسلام ہے بھی یا نہیں۔ میرا اہنسا پر یقین ہے پاکستان سے کہتا ہوں۔ مل جل کر مسئلے کو سلجھالو۔ پختونوں کی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی ہے۔ ہوا یہ کہ اب لڑکیاں بھی میدان میں اتر آئیں ہیں کہیں یہ بھی بلوچوں کی طرح بندوق نہ تان لیں۔

غفار خان کا یہ لیکچر بہت دل پذیر (من کو چھونے والا) ہے اس میں ہندوپاک کے بیچ

ہوئی جنگوں کا ذکر بھی ہے۔ کئی لوگوں نے کہا تھا کہ خان صاحب ہندوستان چلے گئے انھیں بتانا پڑا کہ وہ نہیں گئے وہ یہیں بیٹھے ہیں انھوں نے زوردار لفظوں میں کہا تھا "تم چاہتے ہو میں ہندوستان نہ جاؤں، نہیں جاؤں گا مجھے میرا حق دے دو میں کسی دوسرے سے اپنا حق نہیں مانگتا"۔

پوری تقریر میں خان صاحب بہت دکھی تھے۔ انھیں کچھ نہیں چاہئے بس وہ پختونوں کو خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ انھیں مہاتما گاندھی کی بار بار یاد آتی۔ تقسیم بھی نہیں چاہتے تھے انھوں نے گاندھی جی سے کہا تھا:۔

"مہاتما میں چل رہا ہوں۔ شمال مغربی صوبہ سرحد میں بدقسمتی میرا انتظار کر رہی ہے"۔

گاندھی جی نے تب کہا تھا:۔

"خاں صاحب! اہنسا کبھی اس طرح ناامید نہیں ہونے دیتی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان آپ کو قبول نہیں ہے۔ پھر جو ہو مقابلہ بھی آپ کر سکتے ہیں۔ میں نے جیسے مقابلہ کیا ہے وہ دنیا جانتی ہے"۔

سب جانتے ہیں کہ ہندوستان کی تقسیم انگریزوں کی ایک چال تھی۔ وہ کامیاب ہوئے۔ وہ بیج بو گئے ہیں تڑپنے کے لیے

دوسری جنگ میں گاندھی جی نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا غفار خان بھی ان سے متفق تھے یہ عجیب فیصلہ تھا نہ مانتے تو؟ ایک حکمراں چلا جاتا دوسرا آجاتا گاندھی اس کے لیے متفق نہیں تھے۔ یہی رائے خان صاحب کی بھی تھی۔ ٹھیک گاندھی جی کے نقش قدم پر چلنا اور اس راستے پر چلتے ہوئے اپنے حقوق مانگنا

ان کی سوچ اور خیالات بہت واضح ان کا کہنا تھا کہ جب ہندوستان آزاد ہوا تب ناانصافی نہیں ہوئی۔ جو لوگ آزادی کے لیے لڑے تھے انھیں اس کے عوض سب کچھ مل

گیا۔ پاکستان میں اس کے عین خلاف ہوا۔ مسلمان بھی آزادی کے لیے لڑے تھے۔ پاکستان میں انھیں جیل بھیجا گیا۔ انھیں تکلیفیں جھیلنی پڑیں۔ وہ جیلوں میں رہے ان کے گھر اجاڑے گے۔ انھیں ایذائیں پہنچائی گئیں۔ اسی لیے غفار خان نے پھر دوسری لڑائی کا آغاز کیا۔ پختونوں کو اگر ان کے حقوق حاصل ہو جائیں تو وہ کیوں پاکستان سے لڑیں گے؟ جن لوگوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کی ہے انھیں اس کا معاوضہ ملنا چاہئے۔ آزادی کے لیے لڑنے والے آج اور بھی زیادہ پریشان کئے جارہے ہیں۔ یہ تو اسلام میں بھی نہیں کہا گیا ہے۔ یہ پختونوں کی لڑائی ہے۔ یہی لڑائی ہے جو ان کے قائد غفار خان لڑتے رہے۔ ان کے ساتھ دھوکا کیا گیا۔ وہاں کے قبائلوں کے لیے کوئی یقین دہانی نہیں کی گئی تھی تب غفار خاں نے گاندھی جی سے پوچھا تھا "ہم کیا کریں؟" گاندھی جی نے کہا تھا:۔

"اہنساسب سوالات کا جواب ہے۔ آپ کہہ دیں کہ ہمیں پاکستان منظور نہیں ہے خان صاحب نے کہا تھا "اگر تب بھی پاکستان بن گیا تو میں وہیں رہوں گا"۔ گاندھی جی بے حد دکھی تھے۔ ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

سچ پوچھو تو اسکیم دوسری تھی۔ پلان یہ تھا شمالی مغربی سرحد صوبے میں استصواب (رائے شماری) کرا کر یہ پتہ لگایا جائے کہ جنتا بھارت کے ساتھ رہنا چاہتی ہے یا پاکستان کے ساتھ۔ خان صاحب نے کہا یہ "سوال اب بے معنی ہے۔ ہند کی تقسیم سمجھوتے کے تحت ہوئی تھی۔ بھارت اور پاکستان دو فریق تھے۔ یہ طے ہو گیا تھا کہ جغرافیائی نقطۂ نظر سے شمالی مغربی صوبہ بھارت سے دور چلا گیا ہے اب دوسری بات رہ گئی ہے۔ پاکستان اور آزاد پٹھان ریاست مسلم لیگ کو یہ طے کرنا ہے کہ اس میں سے پٹھانوں کا علاقہ کس کے ساتھ رہے۔ رائے شماری میں جو طے ہو وہی مناسب ہے۔ پاکستان کے ساتھ رہنا ہے تو خان صاحب پہلے

آدمی ہونگے جو پاکستان کے ساتھ ہوں گے۔

کئی دلیلیں پیش کی گئیں۔ پختونستان کے پاس وسائل نہیں ہیں وہ آزاد نہیں رہ سکتا۔ خان صاحب نے کہا تھا۔ "وہ اطمینان سے جھونپڑیوں میں رہ لیں گے، روکھی سوکھی کھالیں گے لیکن غلام نہیں رہ سکتے۔ وہ ترقی کے وسائل خود پیدا کرلیں گے خان صاحب نے صاف صاف کہا کہ پختونستان کے لوگ اپنی آزاد مملکت چاہتے ہیں ان کے سامنے ذات یا مذہب نہیں ہے۔ پشتو بولنے والوں کا الگ صوبہ بنانا تھا۔ مسلم لیگ نے یہ تسلیم نہیں کیا۔ ماؤنٹ پس و پیش میں تھے۔ آخر 1946ء میں صوبہ سرحد میں انتخابات ہوئے۔ اس میں کانگریس نے 50 میں سے 32 سیٹوں پر کامیابی حاصل کی۔ ان میں 38 مسلمان تھے جن میں اکیس پختونوں نے جیتیں دو ہندوؤں نے اور تین سکھوں نے ۔ ان نتائج سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن فکر میں مبتلا ہوگئے۔ سیاسی واقعات کا سلسلہ جاری تھا لیکن آخر میں کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوا۔ پختونوں کے لوگ بھیڑیوں کے حوالے کر دیے گئے۔ یہی سب سے بڑا درد تھا۔ غفار خان کی آنکھوں میں صحراؤں کا سا سونا پن سما گیا تھا، دل میں سمندروں کی گہرائی تھی لیکن خواب تب بھی شکست نہیں ہوئے تھے۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود ان میں جوش تھا ایک پٹھان جوش۔ پٹھان اپنی مٹھی سے کوئی بھی چیز آسانی سے جانے نہیں دیتا۔

غفار خان کا درد گاندھی جی کا درد تھا۔ جناح استصواب (رائے شماری) کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ مسلم لیگ نے تجویز پاس کی ۔ دوسری طرف افغانستان تھا۔ اس نے ڈیورنڈ لائن (ریکھا) کا تنازع کھڑا کر دیا۔ ڈیورنڈ ریکھا۔ ہندوستان اور افغانستان کی سرحدوں کے درمیان حد فاصل ہے۔ مسلم لیگ نے اس کی مخالفت کی۔ غفار خان پر الزام تراشی کی گئی۔ الزام یہ تھا کہ وہ افغانستان سے ساز باز کر رہے ہیں۔

گاندھی جی کو اس سے دھکا لگا۔ وہ غفار خان کا درد پہچانتے تھے انھوں نے کہا۔
"میں 125 سال زندہ رہوں گا۔ غفار خان کے دل کا درد تب بھی نہیں بھول پاؤں گا۔ غفار خان لڑنا جانتا ہے وہ کبھی ہار نہیں مانے گا۔ وہ ہر طرح کی قربانی دے سکتا ہے۔ اخیر دم تک وہ پٹھانوں کے لیے لڑتا رہے گا"۔

گاندھی جی اس رات سو نہیں سکے۔ پاکستان کا درد غفار خان کو اور ستانے لگا۔ ان پر بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ گاندھی جی نے تب وائسرائے کو ایک خط لکھا۔ لارڈ ماؤنٹ بٹین کو خط ملا تھا اس میں تحریر تھا۔

"بادشاہ خان بہت غمگین ہیں۔ پنجاب کے مسلمان صوبہ سرحد میں بسائے جا رہے ہیں۔ اس سے رائے شماری پر اثر پڑے گا۔ پاکستان افغانوں کو الیکشن (مت دان) کے لیے مجبور کر رہا ہے وہ اگر اپنی رائے کا استعمال نہیں کرتے تو استصواب کی شرط توڑتے ہیں۔ عجیب بات ہے یہ دونوں طرف سے پٹھانوں کو ستایا جا رہا ہے"۔

لارڈ ماؤنٹ بٹین نے خط صوبہ سرحد کے گورنر کو بھیج دیا۔ پاکستان کی سرکار کسی طرح استصواب پر آمادہ ہوئی تھی۔ اس نے اور سختی شروع کر دی۔ پختونوں کو کافر کہا۔ لال کرتہ پہنتے والوں پر پابندی لگا دی۔ اسی تنازعے کے درمیان رائے شماری (مت دان) ہوئی 80 سے 90 فیصد ووٹ پڑے۔ خدائی خدمت گاروں اور ان کی پارٹی نے چناؤ میں حصہ نہیں لیا۔ آخر سرحدی صوبہ پاکستان کا حصہ قرار دے دیا گیا۔

30/ جولائی 1947ء کی بات ہے۔ گاندھی جی کشمیر گئے۔ غفار خان آخری بار ان سے ملے۔ گاندھی جی نے ان سے کہا "پاک کو پاک کرو"۔ جدا ہوئے غفار خان نے کہا "گاندھی جی نے ہمیں سچا راستہ بتایا ہے۔ گاندھی عظیم ہے۔ مرنے کے بعد ہندو

انھیں کرشن کا اوتار مانیں گے۔ مسلمان انھیں فرشتہ کہیں گے۔ اور عیسائی شانتی کا مسیحا۔ خدا! انھیں لمبی عمر دے وہ بھارت کی رہنمائی کریں گے۔ ہمیں بھی وہ لڑنے کی طاقت دیں۔ آنے والا وقت بھیانک ہو گا۔ گاندھی جی کا نام ہی طاقت دے گا"۔

گاندھی جی نے غفار خان کو الوداع کہا

"جاؤ۔ اپنے وطن کی خدمت کرو"۔

اس کے بعد خان صاحب اور گاندھی جی کبھی نہیں ملے۔

15/ اگست 1947ء کو ہندوستان کو آزادی مل گئی۔ انگریزوں نے ڈیڑھ سو سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ غفار خاں کی اصل لڑائی اب شروع ہوئی۔ خان صاحب کی وزارت اب بھی تھی۔ تقسیم کے بعد بھی وہ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے رہے۔ تب محمد علی جناح پاکستان کے گورنر جنرل بنے تھے۔ 29/ اگست 1947ء کو انھوں نے ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو برخاست کر دیا۔

غفار خان اور زیادہ غمگین ہو گئے۔ سارے قانون اور ضابطے بالائے طاق رکھ دیے گئے تھے۔ غفار خان ہارنے والے نہیں تھے۔ صوبہ سرحد میں ایک نئی تنظیم تشکیل دی گئی۔ نام رکھا گیا۔ "جل مئی پختون" نوجوانانِ پختون کی تنظیم۔ سرداریاب میں جلسہ ہوا۔ خدائی خدمتگار اور قبائلی بڑی تعداد میں شامل ہوئے۔ پٹھانوں کے لیے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا گیا۔ کہا گیا وہ اندرونی طور سے خود مختار ہوں لیکن رہیں گے پاکستان کے ساتھ ہی۔ ایک تجویز پاس کی گئی۔ اس میں شمال مغرب کے چھ اضلاع کو پٹھانوں کا علاقہ بتایا گیا تھا۔ یہ علاقہ حکومت پاکستان سے معاہدہ کرے گا۔ دفاع، امور خارجہ اور مواصلات حکومت پاکستان دیکھے گی۔ باقی سب امور میں پٹھان آزاد ہوں گے بادشاہ خان نے اعلان کیا

"میں عمر بھر پٹھانستان کے لیے لڑا ہوں۔ پٹھانوں میں اتحاد قائم کیا ہے۔ اس کے لیے 1928ء میں خدائی خدمتگار تنظیم بنائی اس کے ضوابط اور اصول بنائے میں آج بھی ان اصولوں پر قائم ہوں۔ میرا راستہ صاف ہے۔ میں سمجھوتہ نہیں کروں گا۔ اکیلا بھی اگر لڑنا پڑے تو لڑوں گا"۔

پاکستان سرکار نے قہر ڈھانا شروع کر دیا۔ بندقیں سادھ لی گئیں اس میں شک نہیں تھا کہ لڑائی ضرور شروع ہو گی۔ یہ خانہ جنگی (سول وار) ہو گی۔ مہاتما نے سنا تو دکھی ہوئے۔ انھیں غفار خان کی طرف سے فکر تھی۔

غفار خان کو گاندھی جی کا ایک خط ملا۔ 17/ نومبر 1946ء کا دن تھا گاندھی جی نے لکھا تھا:

"بادشاہ خان مجھے تمہاری جان کا خطرہ ہے۔ تم صوبہ سرحد چھوڑ دو۔ بھارت آجاؤ۔ بھارت سے ہی تم اہنسا کی لڑائی لڑ سکتے ہو وہاں ہنسا (تشدد) ہو گی۔ تمہیں بھی تشدد کا راستہ اختیار کرنا ہو گا اس سے کچھ نہ بنے گا اہنسا (عدم تشدد) ہی واحد راستہ ہے۔

بادشاہ خان بزدل نہیں تھے انھوں نے صوبہ سرحد نہیں چھوڑا وہیں رہے تکلیفیں برداشت کیں۔ گاندھی جی کے خط کا انھوں نے جواب دیا

"گاندھی جی آپ میری فکر نہ کریں اپنا آشیرواد دیجئے اور میرے لیے دعا کیجئے"۔

بادشاہ خان اپنے بھائی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رہنے لگے۔ غفار خان کو ایک اور دھکا لگا۔ گاندھی جی سے انھیں عمر بھر تحریک ملی تھی۔ اچانک 30/ جنوری 1948ء کو عدم تشدد (اہنسا) کے پجاری کو گولی ماری گئی۔ گاندھی چل بسے۔ بادشاہ خان بچوں کی طرح روئے۔ کئی راتیں جاگتے بیتیں۔ اب ان کو راستہ کون دکھائے گا؟

فروری 48ء کو باد شاہ خان کراچی گئے۔ پاکستان کی پارلیمنٹ میں حصہ لیا اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی باد شاہ خان نے اپنی تقریر میں کہا

"اسلام کا جوہر مساوات ہے دوسروں پر رعب ڈالنا نہیں ہم پٹھان لوگ دوسروں کے حقوق چھیننا نہیں چاہتے نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کوئی ہمارے حقوق پر ڈاکہ ڈالے پاکستان میں چار قومیں ہیں پٹھان، پنجابی، بنگالی اور سندھی۔ ہم سب بھائی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سب مل کر رہیں۔ ایک دوسرے کے کی کاموں میں مداخلت نہ کریں سب کو اپنی طرح کام کرنے دیا جائے۔ ضرورت پڑنے پر وہ دوسرے کی مدد کر سکیں"۔

باد شاہ خان قائد اعظم جناح سے بھی ملاقات کی۔ کہا "پاکستان کو مضبوط بنانا ہے تو پٹھانوں کو مضبوط بناؤ۔ وہ محب وطن ہیں۔ ملک کی حفاظت کریں گے۔ میں تو صرف ایک سپاہی ہوں مجھے حکومت نہیں چاہیے" جناح نے سوال کیا:۔

گاندھی جی نہیں رہے۔ بھارت کے مسلمانوں پر ظلم نہیں ہوگا؟ باد شاہ خاں نے کہا:۔

نہیں جواہر لال ہیں۔ بابو راجیندر پرشاد ہیں اور بھی لیڈر ہیں۔ وہ کبھی گاندھی جی کے راستے کو ترک نہیں کریں گے۔ ہندوستان میں مسلمان محفوظ ہیں اور رہیں گے۔ "باد شادہ خان نے مشورہ دیا ان کا کہنا تھا کہ مسلم لیگ فرقہ واریت کو بڑھاوا دے رہی ہے۔ مسلم لیگ کو تحلیل (ختم) کر دینا چاہئے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہندوستان سے خوشگوار تعلقات بنائے جائیں۔

جناح نے ان کی صلاح کو ان سنا کر دیا۔ مسلم لیگ کو ختم کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہوئے۔ غفار خان نے تب پاکستان سرکار کو تعاون دینے کا وعدہ کیا۔

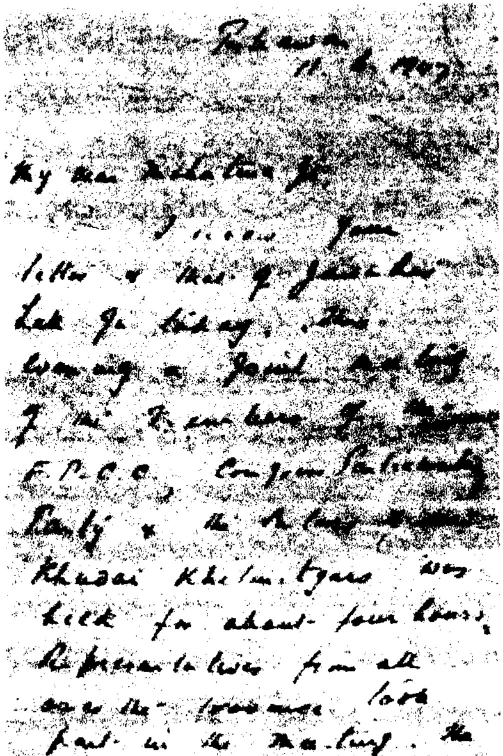

Peshawar
11. 6. 1947

My dear Mahatma Ji

[illegible]
[illegible] of the [illegible]
[illegible]
[illegible]
F.P.C.C., [illegible]
[illegible]
Khudai Khidmatgars was
held for about four hours.
Representatives from all
over the province took
part in the meeting. The
[illegible]

گاندھی جی کو لکھے گئے خان عبدالغفار خان کے ایک خط کی نقل

غفار خان واپس چلے گئے ۔ جاتے ہی پھر پریشانی۔ جناح نے حکم دیا کہ خدائی خدمتگار پارٹی کو توڑ دیا جائے۔ اسے مسلم لیگ میں شامل ہو جانا چاہیے۔ بادشاہ خان اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انھوں نے اعلان کیا:

"سرکار سے گفت وشنید کا سلسلہ ٹوٹ گیا ہے اب کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔ خدائی خدمتگار پارٹی کو مضبوط بنایا جائے" جگہ جگہ اس کی شاخیں کھولی گئیں اس وقت خان عبدالقیوم شمالی مغربی صوبے سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے۔ قیوم خان نے لال کرتی جماعت کو منظوری نہیں دی اس نے کہا یہ ملک کے غدار ہیں۔

غفار خان نے اپنی جنتا کو پھر اٹھایا۔ اگلی لڑائی کے لیے تیار کیا۔ غفار خان نے یہاں تک کہا کہ جناح پاکستان کے گورنر جنرل نہیں ہیں انھیں انگریز حکومت نے مقرر کیا ہے۔ غفار خان نے کہا:

"پٹھانو! تم پاکستان کے ایک چوتھائی حصے کے حقدار ہو تمہیں چوتھائی ملنا چاہیے۔ اٹھو، متحد ہو جاؤ اپنے حقوق کا مطالبہ کرو۔ پاکستان نے ریت کی دیواریں کھڑی کی ہیں۔ انھیں توڑ دو۔ تم شیر ہو اپنے پنجے مضبوط کر دو پٹھانوں کی آزادی کے لیے لڑو۔ ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے ۔ ہم پٹھانستان بنا کر رہیں گے ۔ وہاں پٹھانوں کی حکومت ہوگی۔ پٹھانوں کے لیے ہوگی پٹھانوں کے ذریعہ ہوگی۔

تین دن بعد غفار خان کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے بیٹے ولی خان کو گرفتار کیا گیا، ان پر مقدمہ چلا اور تین سال قید کی سزا دی گئی۔

اس کے بعد خدائی خدمتگاروں کو ایذائیں دی گئیں۔ 12/اگست 1948ء کو لال کرتی والوں پر گولیاں چلائی گئیں۔ بابرہ گاؤں کا میدان خون سے رنگ گیا سرکار کے کہنے کے

مطابق 15 / مرے اور 50 زخمی ہوئے۔ لیکن یہ صحیح نہیں تھا۔ سینکڑوں لوگ مارے گئے تھے۔ اتنا بڑا قتل عام پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

تب سے لے کر آخری سانس تک غفار خان مسلسل لڑتے رہے۔ جیل سے چھوٹتے تھے پھر جیل چلے جاتے تھے جیل میں بے حد تکلیفیں دی جاتی تھیں۔ جیل سے باہر آتے تو عوام گھیر لیتے تیس ہزار سے بھی زیادہ کا مجمع ہوتا۔

غفار خان کی پوری زندگی اتار چڑھاؤ سے بھرپور تھی۔ جیل اور گھر، گھر اور عوام، عوام اور سرکار۔ اپنا دیس اور بدیس۔ بھارت کے سفر، یہاں کے لیڈروں سے ملاقاتیں۔

جواہر لال کے ساتھ غفار خان کے اچھے مراسم تھے۔ گاندھی جی کی طرح جواہر لال ان کے مزاج کو سمجھتے تھے۔ وہ ان کی ہٹ کو جانتے تھے کہ یہ شخص کبھی چین امن سے نہیں رہے گا۔ اپنے لیے بادشاہ خان نے کبھی کچھ نہیں کیا۔ ان کی ہتھیلی پھیلی رہتی وہ پختونوں کے لیے بھیک مانگتے ہیں۔ جنتا کے لیے، پختونوں کے لیے۔ اب وہ سنگھرش کریں گے۔ کب تک انھیں دبا کر رکھا جائے گا؟ جواہر لال نہرو جی اتنے ہی پریشان ہوتے تھے۔ پر وہ کرتے بھی تو کیا؟ معاملہ غیر ملک کا تھا۔

پاکستان میں کبھی استقامت نہیں رہ پائی۔ حکومتیں بدلتی رہیں پھر فوجی حکومت ہوگئی۔ بادشاہ خان کو سبھی دباتے رہے۔

غفار خان کی زندگی میں بکھراؤ تھا۔ جب وہ ساڑھے چار بجے اٹھتے تو سامنے کی پہاڑی سے صبح اترتی ہوتی۔ صبح چائے پیتے پھر ٹہلنے کے لیے نکل جاتے۔ ساڑھے سات بجے ناشتہ کرتے پھر بارہ بجے تک گفت و شنید۔

پیارے لال نائر گاندھی جی کے بہت قریب رہے ہیں انھوں نے بادشاہ خان کو

بھی پاس سے دیکھا تھا۔23/جولائی1965ء کو انھوں نے ایک جگہ لکھا تھا:۔

"بادشاہ خان کی صحت گر رہی تھی۔ کابل سے لوٹنے کے بعد طبیعت کچھ بہتر ہوئی ہے۔ جیل سے وہ لوٹے تھے۔ جیل میں بھرپور ایذائیں پہنچائی گئیں۔ اتنی شدید کہ وہ موت کے منہ میں پہنچ گئے تھے تب انھیں جیل سے چھوڑا گیا"۔

حیدر آباد سندھ کی جیل میں انھیں اندھیری کوٹھری میں رکھا گیا تنہا! ہوا بھی ٹھیک سے نہیں پہونچتی تھی۔ ان کے پیروں میں ہلکی سی سوجن آگئی لگا کہ گردہ خراب ہو گیا ہے۔ وہاں کا جیلر پنجابی مسلمان تھا۔ اس نے بادشاہ خان کی پرواہ نہیں کی۔ اسپتال بھی نہیں جانے دیا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ گردہ کا کچھ حصہ خراب ہو گیا ہے۔ اپنی طاقت کے بل بوتے پر وہ بچ گئے۔

حیدر آباد سے انھیں لاہور بھیجا گیا۔ کہا گیا کہ وہاں علاج کرایا جائے گا دراصل جیل بدلی گئی تھی۔ کوئی ڈاکٹر دیکھنے کے لیے نہیں آیا۔ ایک سال تک ایسے ہی پڑے رہے۔ جب برداشت کی طاقت نہ رہی تو انھوں نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو لکھا "میرا علاج کراؤ ورنہ میں کھانا چھوڑ دوں گا۔ چار دن بھوک ہڑتال پر رہے۔ اس کے بعد ملتان لے جائے گئے وہاں کے نشتر ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ جولائی، اگست کی گرمی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ ملتان جیسے جلنے لگتا ہے۔ سائے میں بھی ٹمپریچر 117 ڈگری رہتا ہے۔

ملتان میں علاج ٹھیک ہوا۔ حالت کچھ سدھرے لیکن وہاں کی گرمی سہنی مشکل تھی۔ انھوں نے افسران سے کہا انھیں کہیں اور بھیج دیا جائے۔ کچھ دن دھیان نہیں دیا گیا۔ وہ بیمار ہو گئے۔ تب انھیں لاہور جیل بھیج دیا گیا۔

لاہور جیل میں انھیں غلط دوا دے دی گئی۔ وہ درد سے تڑپنے لگے جیل کے ڈاکٹر

نے درد کم کرنے کی کوئی دوا نہیں دی۔ اتنا ہی نہیں لائٹ بجھادی گئی پورا اندھیرا ہو گیا۔ باہر سے تالا لگادیا گیا۔ ان ایذاؤں سے ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا پہلے بلڈ پریشر (Low) رہتا تھا۔ بلڈ پریشر بڑھنے سے دل متاثر ہوا، جگر خراب ہوا، گردہ بگڑا۔ پیروں میں پھر سوجن آگئی اور چلنا پھر ناد شوار ہو گیا۔ حالت بگڑ گئی تو انھیں ہری پور بھیجا گیا۔ کچھ عرصہ ہری پور جیل میں رہے پھر گھر آگئے۔ گھر جیل بن گیا۔ انھیں امریکہ جانے کا مشورہ دیا گیا۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ علاج وہیں ہو سکتا ہے۔ پاکستان حکومت نے پھر چال چلی۔ امریکہ سرکار کو انہیں ویزا نہ دینے کی ہدایت کی۔ ہار کر غفار خان نے افغانستان جانا چاہا۔ پاکستانی سفارت خانہ نے انھیں وہاں بھی نہ جانے دیا۔ ہندوستان آنا چاہا تو بھی حکومت نے منع کر دیا۔ وہ قاہرہ گئے اور وہاں سے کسی طرح افغانستان پہنچ گئے۔

افغانستان پہنچ کر غفار خان نے چین کا سانس لیا۔ انھوں نے طے کیا کہ اب وہ کبھی پاکستان نہیں جائیں گے۔ وہاں گئے تو موت ہو جائے گی۔

افغانستان میں ان سے ایک ہندوستانی نمائندہ وفد ملا جو ہیلسنکی سے لوٹ رہا تھا۔ ان سے بات کرنا خان صاحب کو اچھا محسوس ہوا۔

ان کا علاج شروع ہوا۔ پتہ چلا کہ حالت بہت بگڑ گئی تھی، دل کمزور ہو گیا تھا۔ بار بار بیہوش ہو جاتے تھے۔ نسیں کمزور ہو گئیں تھیں۔ بھوک اڑ گئی تھی رات میں نیند نہیں آتی تھی۔ وہ چیکوسلواکیہ کے ایک ڈاکٹر کے زیر علاج تھے ڈاکٹر بہت لائق تھے لیکن کچھ عرصہ بعد انھیں اپنے وطن جانا پڑا۔ نسوں کو طاقت پہنچانے کے لیے ہسپتال میں سکائی کی جاتی یہ کام ایک معمولی آدمی کرتا تھا۔

آہستہ آہستہ ان کی حالت سدھری۔ ان کی قوت ارادی نے ساتھ دیا۔ ان میں

طاقت برداشت بھی کافی تھی۔ علاج لمبا چلنا تھا۔ کھانا بھی اچھا دیا جاتا تھا انھوں نے سادہ کھانا ہی پسند کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سرکار ان پر زیاہ خرچ کرے۔

طویل علاج کے بعد وہ گھر واپس آگئے۔ اس وقت کابل کا نقشہ بدل چکا تھا۔ سپاٹ کشادہ سڑکیں بن چکیں تھیں۔ مسجدوں اور مقبروں کی مرمت کی جاچکی تھی۔ بڑی بڑی عمارتیں بن گئیں تھیں۔ کالج کھل گئے تھے۔ بچوں کی فیس کم ہوگئی تھی۔ شہر میں جرائم کی تعداد کم ہوگئی تھی۔ بہت سے چھوٹے بڑے کارخانے کھل گئے تھے۔ یہ سب دیکھ کر غفار خان بہت خوش ہوئے۔

افغانستان میں غفار خان کا شاندار استقبال ہوا لیکن وہ وہاں بہت دنوں تک نہیں رہ سکتے تھے۔ انھیں پختون بھائی بلا رہے تھے اس لیے انھیں پاکستان لوٹنا پڑا۔

بادشاہ خان نے طویل عمر جیل میں بتائی تھی 1944ء میں وہ ہری پور کی سینٹرل جیل میں تھے۔ اس جیل کا دروازہ فتح پور سیکری کے بلند دروازے سے کم نہیں ہے۔ وہ شاذ و نادر ہی کھلتا ہے۔ زیادہ آنا جانا چھوٹے دروازے سے ہوتا ہے۔ غفار خان نے یہاں کے بارے میں بتایا تھا:

"ایک دن میں دوسرے احاطے میں کھڑا باتیں کر رہا تھا کوہاٹ کا ایک ساتھی آیا۔ وہ تحصیل میں خدائی خدمتگاروں کا جنرل تھا۔

آکر کہنے لگا "خدا کا بھی عجیب انصاف ہے" "میں نے پوچھا کیا ہوا؟"

وہ بولا "وہ بڑا دروازہ گدھوں کے لیے کھل جاتا ہے۔ ہم چار سو خدمتگار ہیں ہمارے لئے نہیں کھلتا"۔

پتا چلا کہ جیل میں مرمت ہو رہی تھی۔ کوڑا گدھے ڈھوتے تھے۔ انہی کے لیے بڑا

دروازہ کھلتا تھا۔ اسی بات نے جنرل صاحب کو پریشان کر رکھا تھا۔

غفار خان نے جیل کا ایک اور واقعہ بھی سنایا:۔

ایک سالار صاحب بھی جیل میں بند تھے۔ وہ ایک دن اخبار پڑھ رہا تھا۔ کسی نے خبر پوچھی۔ اس نے لاپرواہی سے کہہ دیا "کچھ نہیں" اس پر سننے والا بگڑ گیا۔ کہنے لگا۔ چھاپہ خانہ والوں نے اتنی سیاہی کس چیز پر لگائی ہے۔ اس میں خبریں نہیں ہیں۔ سیاہی ہی یہاں بھجوادیں۔ اس سیاہی سے کسی کا منہ تو کالا کر سکیں گے سالار صاحب بگڑے۔ انھوں نے اخبار پڑھنا بند کر دیا۔

میں نے پوچھا "اخبار پڑھنا کیوں بند کر دیا ؟" بولے "کوئی خبر ہی نہیں ہوتی۔ خبریں ہیں :۔ انگریزوں کا گاندھی کی شرطیں مان لینا۔ غفار خان اور ہماری رہائی کا حکم۔ کوہار کی تحصیل ہنگو میں موسلا دھار بارش۔ بس اور کچھ نہیں۔ یہ ہی خبریں ہیں"۔

غفار خان کے پاس قصوں کی کمی نہ تھی۔ ایبٹ آباد سے چلتے وقت وہ کچھ مرغیاں لے آئے تھے اب وہ بڑھ کر چھتیس ہو گئی تھیں۔ خوب موٹی۔ انڈے بھی دیتیں۔ ہر روز انڈا کھانے کو مل جاتا۔ امیر محمود خاں کو انڈوں سے چڑ تھی وہ مرغیاں کھانا چاہتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے، مرغیاں سر ڈالے ہوئے ہیں، یہ اچھی علامت نہیں ہے پھر ایک بیماری کا نام بھی لیا۔ غفار خان پہلے تو گھبرائے پھر ساری بات سمجھ گئے۔ بولے "ان کا علاج ضروری ہے۔ ان کو دوڑاؤ" اب مرغیاں آگے آگے امیر محمود خان پیچھے پیچھے۔ کِش کِش کرتے دوڑے جا رہے تھے۔ ہنسی کے مارے سب لوٹ پوٹ۔ بعد میں غفار خاں نے پوچھا "بھئی کیوں دوڑے تھے ؟"۔

امیر محمود نے جواب دیا "شاید کوئی مرغی گر پڑے تو شوربہ بناؤں" غفار خاں نے

کہا "کیوں غریب کی جان کے پیچھے پڑے ہو"۔

غفار خان جیلوں میں بہت تکلیفیں جھیلتے تھے لیکن وہیں لطف بھی اٹھاتے تھے وہ اپنی زندگی کے بارے میں بہت کم ذکر کرتے تھے۔1980ء میں وہ بغرضِ علاج ہندوستان آئے تھے۔چار ماہ وہ دہلی میں آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں زیر علاج رہے۔

غفار خان کو بھارت میں پیار ملا تھا جس سے وہ بہت خوش تھے۔ڈاکٹر ان کی پوری پوری دیکھ بھال کر رہے تھے۔ان کے چہرے پر صحت کی چمک ابھر رہی تھی کہنے لگے۔

"پہلے سے میں بہتر ہوں۔خود کو اچھا محسوس کر رہا ہوں"۔یہاں پر ہر آدمی پیار سے پیش آتا ہے،عزت کرتا ہے۔ڈاکٹر پوری طرح خدمت میں لگے ہیں۔یہاں کے وزراء بھی آتے ہیں۔وزیر اعظم بھی آئی تھیں۔لگتا ہے صحیح معنوں میں یہی میرا وطن ہے"۔

غفار خان بھارت سے علاج مکمل کرا کر گئے تھے اب وہ پیدل چل سکتے تھے۔گٹھیا کا درد بہت کم ہو گیا تھا۔ہوائی اڈے پر جب انھیں وداع کیا گیا تو ان کا دل بھر آیا۔انھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ ایک گاندھی اور بھی ابھی زندہ ہے۔ہر بات میں وہ مہاتما گاندھی کا نام لیتے تھے۔کہتے تھے۔

"وہ انسان نہیں دیوتا تھا۔ایسا انسان اب کبھی پیدا نہیں ہوگا" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں بھر آیا کرتیں۔

1985ء کانگریس کا صد سالہ جشن۔مقام بمبئی کا بریبورن اسٹیڈیم۔بھیڑ اور زبردست چہل پہل۔اسی بھیڑ میں ایک عظیم شخصیت کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ان کے لیے سرکار نے ایک خصوصی طیارہ بھیجا ہے۔وہ جلسہ میں تشریف لائے تو سارا اسٹیڈیم نعروں سے گونج اٹھا۔

ستمبر 1969ء کو خاں عبدالغفار ہندوستان آئے تھے انھیں جواہر لال نہرو اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ اس موقع پر حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے۔

خان عبدالغفار خان! ہاں، وہی تھے۔ 1980ء کے بعد ایک بار پھر ہندوستان

آئے تھے اس بار صرف کانگریس کے اجلاس میں شامل ہونے کے لیے آئے تھے۔ کانگریس کا پہلا اجلاس سو سال پہلے اسی شہر بمبئی میں منعقد ہوا تھا اس وقت کانگریس کی پوزیشن دوسری تھی۔ بڑے بڑے پائے کے لیڈر تھے۔ دیس کو آزاد کرانے کے لیے انھوں نے کانگریس کی بنیاد رکھی تھی۔ سب نے جی توڑ کر ایثار کے جذبے سے کام کیا تھا اور ان کی قربانیوں کے نتیجے میں ہی ملک آزاد ہوا تھا۔

اس بار خان عبدالغفار خان علیل (بیمار) تھے۔ وھیل چیئر (پہیوں والی گاڑی) پر ہی آجاسکتے تھے۔ کھڑے ہونا دشوار۔ لرزتا کپکپاتا کمزور جسم۔ آواز میں لکنت۔ تب بھی ان کی آن بان ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہی غصہ وہی تیز آواز۔ آواز تیز تب ہوتی تھی جب پچھلی یادیں امنڈ آتیں۔

1934ء میں اسی اسٹیڈیم میں کانگریس کا سالانہ اجلاس تھا۔ اجلاس کے خصوصی منڈپ (پنڈال) کا نام غفار خان پنڈال رکھا گیا تھا۔ ان سے اجلاس کی صدارت کرنے کی درخواست کی گئی انھوں نے نہایت عاجزی کے ساتھ اسے ٹھکراتے ہوئے کہا تھا:۔
"میں تو ایک معمولی سپاہی ہوں، عمر بھر سپاہی ہی رہنا چاہتا ہوں میں کبھی جنرل نہیں بنوں گا"۔

یہ عاجزی ان میں ابتدا سے ہی تھی۔ اسی لیے انھیں پختونوں کا پیار ملا۔ وہ انھیں بادشاہ خان کہتے تھے۔ مہاتما گاندھی بھی انھیں پٹھانوں کا بادشاہ کہا کرتے تھے۔

غفار خان نے جتنے سال جیل کے باہر گذارے تھے اس سے زیادہ جیل کے اندر۔ آزادی سے پہلے انگریزوں کی جیل تھی۔ بعد میں حکومت پاکستان کی جیل۔ پاکستان سرکار نے زیادہ زیادتی کی۔ ایک بار میں سات سات سال کی سزا دی۔ اتنی لمبی سزا انگریزوں نے

بھی کبھی نہیں دی تھی۔ اور اس کے بعد بارہ سال سے بھی زیادہ جلاوطنی زمین جائداد فوجی حکومت نے ہڑپ لی۔

غفار خان کو ہندوستان سے پیار تھا۔ ہندوستان ان کا قرض کبھی نہیں چکا سکتا۔ وہ کسی بھی حال میں گاندھی جی کے راستے سے نہیں ہٹے۔ اس بار خان عبدالغفار خان یاباشاہ خان یاسرحدی گاندھی جسم سے لاچار تھے۔ ان کی صحت بری طرح سے گر چکی تھی۔ ذہن بھی متاثر تھا کچھ یاد رہتا کچھ بھول جاتے وہ بے بس زندگی کی گرفت میں تھے ان کی عمر 95سال تھی۔ ان کے صاحبزادے ولی خان نے کہا:۔

"کون کہہ سکتا تھا کہ وہ 95 سال کے تھے۔ پہلے تاریخ پیدائش کا حساب تو رکھا نہیں جاتا تھا۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ سو سال سے اوپر تھے"۔

پانچ چھ سالوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو بھی ہو وہ اس صدی کے روشن چراغ تھے۔ ہم خوش نصیب تھے کہ گاندھی جی کی موت کے بعد ایک اور گاندھی حیات تھا۔ لیکن 20/ جنوری 1988ء کو پیشاور میں طویل بیماری کے بعد ان کی وفات ہوئی۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین افغانستان جلال آباد میں ان کی رہائش گاہ کے احاطے میں ہوئی۔

خان عبدالغفار خان امر رہیں گے ان کی زندگی طوفانوں کی تاریخ ہے۔ اپنے لیے کو ن نہیں جیتا۔ لیکن وہ دوسروں کے لیے زندہ رہے۔ خان عبدالغفار خان کی اپنی کوئی زندگی نہیں تھی ان کی زندگی پٹھانوں کے لیے وقف تھی۔ ان کے ساتھ اس پوری پٹھان قوم کو سلام!!

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

تاریخ تحریک آزادی ہند (مکمل سیٹ)

مصنف: ڈاکٹر تاراچند
چار جلد
مکمل سیٹ قیمت -/794 روپے

تحریک خلافت

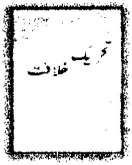

مصنف قاضی محمد عدیل عباسی
صفحات 277
قیمت -/65 روپے

جان کمپنی سے جمہوریت تک

مصنف مشیر الحسن
صفحات 346
قیمت -/114 روپے

مجاہدان آزادی

مصنف ڈاکٹر بی این چوپڑا
دو جلد
مکمل سیٹ قیمت -/213 روپے

ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت

مرتب: رشید الدین خان
صفحات 684
قیمت -/58 روپے

ڈاکٹر ذاکر حسین شخصیت و معمار

مرتب: ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
صفحات 400
قیمت -/70

Rs. 21/-

ISBN 978-81-7587-694-1

9788175876941

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of HRD, Department of Higher Education, Government of India

FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110 025